ادراک

محمد یوسف وسیر

سید پبلی کیشنز، اردو بازار، لاہور

ادراک

(اردو افسانے)

محمد یوسف وسیر

سید پبلی کیشنز،   اردو بازار لاہور

مصنف: محمد یوسف وسیر

کمپوزنگ: آکاش

پبلشرز: سید پبلیکیشنز، اردو بازار لاہور

باراول: ۲۰۲۳ء

قیمت: ۴۶۰ روپے

پیش لفظ

یہ کتاب میری اُن سوچوں اور مشاہدات کا عکس ہے جو زندگی کے مختلف پہلوؤں کو قریب سے دیکھنے کے بعد لفظوں میں ڈھل گئیں۔ ان افسانوں میں پنجاب کی مٹی کی مہک، انسانی نفسیات کی گہرائیاں اور فلسفے کی ہلکی سی پرچھائیں موجود ہیں۔ میں نے کوشش کی ہے کہ کہانیاں سادہ رہیں مگر ان میں وہ درد، محبت اور سوال شامل ہوں جو ہر دل میں کہیں نہ کہیں بستے ہیں۔ یہ محض میری کاوش نہیں بلکہ زندگی کے اُن لمحوں کا تحفہ ہے جو چپ چاپ دل میں اتر گئے اور کہانی بن گئے۔

محمد یوسف وسیر

انتساب

اپنے وطن پاکستان کے نام

عنوانات

ادراک

بوجھ

درگاہ کا فاصلہ یہاں سے تقریباً چار کوس تھا۔ یوں تو اتنا فاصلہ ایک مضبوط جسم کے مالک ادھیڑ عمر کے آدمی کے لیے مشکل نہیں تھا لیکن ایک تو راستہ بلندی کی طرف جاتا تھا اور دوسرا اس نے ماں کو اٹھا کر درگاہ تک لے کے جانا تھا۔
اپنی ماں کی رہائش گاہ سے یہاں تک کا نو کوس فاصلہ اس نے ایک بند گاڑی میں طے کیا تھا۔ فاصلہ کیسے طے ہو گیا، اسے پتا بھی نہ چلا۔ اب یہاں سے درگاہ تک گاڑی یا کسی اور سواری کا جانا ممکن نہیں تھا۔ اس کی ماں ویسے تو اتنی کمزور نہیں تھی کہ پیدل نہ چل سکے مگر اس کی خواہش تھی کہ بیٹا اسے اپنے کندھوں پر بٹھا کر زیارت کرائے۔
راستہ پُر پیچ اور قدرے عمودی تھا، زائرین نے اپنی مدد آپ کے تحت جہاں جہاں ممکن تھا پتھر کاٹ کاٹ کر سیڑھیوں کی شکل دے کر پیدل چلنے والوں کے لیے کچھ نہ کچھ آسانی پیدا کر لی تھی۔ راستے میں جا بجا پتھروں کو ہموار کر کے بیٹھنے کے قابل بنایا گیا تھا تا کہ مسافر بیٹھ کر سانسیں بحال کر سکیں اور جائزہ لے سکیں کہ کتنا سفر طے ہوا اور کتنا باقی ہے۔
اس نے ماں کو کندھوں پر بٹھایا اور چلنا شروع کر دیا۔ ابتدا میں راستہ بہت آسان تھا، نہ تو بہت بل دار تھا اور نہ ہی زیادہ عمودی۔ اس حصے کو تقریباً تمام لوگ ہی خوشی خوشی طے کر لیتے تھے۔ راستے کے ارد گرد نرم نرم گھاس اور جا بجا پھول دار پودے تھے۔ کہیں کہیں گھنی جھاڑیاں تھیں اور سایہ دار بلند و بالا درخت بھی تھے۔ یہاں سے آگے والا رستہ نظر نہیں آتا تھا، چلنے والے یہی خیال کرتے کہ شاید سارا راستہ ہی آسان اور خوش گوار ہے۔
وہ چلتے چلتے اس مقام تک پہنچ گیا جہاں ستانے کے لیے تھوڑی سی جگہ ہموار کی گئی تھی۔ اس کے جسم اور ذہن پر ابھی تھکاوٹ کے آثار نمودار نہیں ہوئے تھے، مگر ماں کے کہنے پر اسے رکنا پڑا۔ اس نے ماں کو کندھے سے اتارا، ایک

صاف سی جگہ پر بٹھایا اور خود بھی ساتھ ہی گھاس پر بیٹھ گیا۔ان کا رخ اس راستے کی طرف تھا جہاں پر وہ چل کر آئے تھے۔ماں قریب ہی گرے ہوئے ایک درخت کے تنے کو دیکھنے لگی اور وہ آنکھیں موند کر پیچھے دیکھنے لگا۔

اس کا باپ ایک غریب آدمی تھا، بدقسمتی سے اس کی شادی ایک خوب صورت اور کم عمر لڑکی سے ہوگئی جو اپنے شوہر کو دلی طور پر قبول نہ کرسکی حتیٰ کہ بچے کی آمد بھی ازدواجی زندگی میں خوش گوار تبدیلی نہ لاسکی۔

وہ ابھی کم سن تھا اسے حالات سے آگاہی نہیں تھی۔اس کے ماں باپ اس سے بہت محبت کرتے ،اس کا بہت خیال رکھتے، اس کی ہر ضرورت پوری کرنے کی کوشش کرتے ،اگرچہ وہ اسے زیادہ وعدوں ہی سے خوش کرتے تھے لیکن اس کی زندگی میں مسکراہٹیں اور خوشیاں تھیں۔

اس کی ماں نے اسے بازو سے پکڑ کر واپس اپنے پاس بلالیا اور انہوں نے دوبارہ سفر شروع کر دیا۔یہاں سے راستہ کچھ دشوار ہونا شروع ہوگیا تھا، ایک طرف گھاس کے ٹیلے موجود تھے لیکن دوسری طرف ڈھلوانیں تھیں۔تھوڑا آگے جا کر راستہ بائیں جانب مڑتا تھا۔موڑ کے بعد ایک طرف بلند پہاڑی تھی جس کی دیوار پر جھاڑیاں، پھول دار بیلیں اور صنوبر کے درخت لٹک رہے تھے جب کہ دوسری طرف ایک گہری کھائی تھی۔وہ کھائی طرف کم ہی دیکھ رہا تھا، بل کہ کوشش کر رہا تھا کہ اس سے نظریں چرائے اور اس کو ذہن میں بھی نہ لائے۔

اگلا پڑاؤ کافی فاصلہ طے کرنے کے بعد آیا۔اس دفعہ بیٹھنے کا مشورہ ماں نے نہیں دیا، وہ کندھوں پر تھی اور اسے بیٹے کی تھکاوٹ کا احساس شائد نہیں ہوا تھا۔اس نے تھکاوٹ محسوس کرتے ہوئے تھوڑی دیر آرام کا فیصلہ کیا اور ایک مناسب سی جگہ دیکھ کر بیٹھ گیا۔اس نے دوبارہ پیچھے کا سفر کیا اور پھر وہاں پہنچ گیا جہاں سے پچھلے پڑاؤ پر ماں نے اسے بلایا تھا۔

اس کی ماں نے اس کے باپ کی غربت سے پیچھا چھڑا لیا۔اس کا باپ یوں بھی اچھا آدمی نہیں تھا، اور برے شخص کے ساتھ گذارا نہیں ہوسکتا۔کوئی آدمی واقعتاً برا ہوتا ہے؟اس نے خود سے پوچھا، کیا کوئی شخص واقعتاً اچھا ہوتا ہے؟

پھر اس نے خود ہی جواب دیا کہ نہیں، کوئی شخص مطلقاً نہ اچھا ہوتا ہے نہ برا۔اگر وہ اسی طرح عمل کرے جیسے آپ چاہتے ہیں تو وہ اچھا ہے ورنہ برا!۔اگر وہ اسی طرح سوچے جس طرح آپ سوچتے ہیں تو اچھا ہے ورنہ برا!اگر اس کے نظریات وہی ہیں جو آپ کے ہیں تو وہ اچھا ہے ورنہ برا!

اس باپ کے اعمال، اس کی سوچ اور اس کے نظریات اس کی ماں توقعات کے مطابق نہیں تھے لہذا وہ برا شخص تھا۔اس نے اس برے آدمی کو چھوڑ دیا اس آدمی کی خاطر جو اس کے باپ کی نسبت کم برا تھا، اس نے کم اچھے شوہر کو چھوڑ دیا ایسے

شخص کی خاطر جو زیادہ اچھا تھا۔ وہ اتنا اچھا تھا کہ اس کی خاطر وہ اپنی اولاد کو بھی بھول گئی۔ اس نے یہ بھی نہ سوچا کہ تین سال کا بچہ ماں کی محبت سے محروم ہو جائے گا۔

اس نے آنکھیں کھولیں اور اپنی ماں کی طرف دیکھا جو کہ پتھر کا سہارا لیے کہیں گئی ہوئی تھی۔ اس نے نہایت نرم لہجے میں خاموشی کے ساتھ مخاطب ہوتے ہوئے ماں سے پوچھا

''تم نے ایسا کیوں کیا؟

تم اچھی تھی، اگر وہ بھی اچھا آدمی ہوتا تو تم اس کے ساتھ زندگی گذار لیتی۔ لیکن پھر تمھارا کیا کمال ہوتا، تمھاری کیا خوبی ہوتی؟

اچھے کے ساتھ تو سب ہی گذار لیتے ہیں، خوبی تو یہ ہوتی کہ تم برے کو بھی برداشت کرتی، تم اس کے ساتھ زندگی گذارتی جو تجھے ناپسند تھا، تب تو اچھی تھی، اب تو بھی اچھی نہیں!''

جیسے جیسے وہ بول رہا تھا اس کی آواز بلند ہو رہی تھی۔ اس کی آواز اتنی بلند ہوگئی کہ میلوں دور مدفون اس کا باپ بھی یہ آواز سننے لگا۔۔۔۔

اتنی بلند کہ آس پاس کے کیڑے مکوڑے اور درخت بھی اس کی آواز سننے لگے، اس کی آواز کی گونج سے چٹانیں لرزنے لگیں۔ اس کے گلے کی رگیں اور کن پٹیوں کی رگیں ابھر آئیں، اس کی آنکھوں میں سرخی نظر آنے لگی، اردگرد کا ہر ذرہ خوف زدہ ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

اس کی ماں نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کی آنکھوں سے ممتا کی ٹھنڈی اور جامد کر دینے والی پھوار نکلی اور اچانک ہر شے معمول کے مطابق ہوگئی۔

سفر پھر شروع ہوگیا۔ سفر کا یہ حصہ خوف ناک تھا۔ ڈھلوان عمودی ہوگئی، ایک طرف پہاڑ کی بلند دیوار، دوسری طرف دوسری طرف گہری کھائی جو ایک خشک نالے پر ختم ہوتی تھی، رستے کو اس طرح کاٹا گیا تھا کہ اگر احتیاط سے چلیں تو پتھر سیڑھی کا کام دیتے تھے اور بے احتیاطی کی صورت میں انہیں پتھروں سے ٹھوکر کھا کر انسان گہری کھائی میں بھی گر سکتا تھا۔ یہاں سے درگاہ کی عمارت نظر آ رہی تھی۔

وہ ماں کو اٹھائے اس خطرناک راستے پر چلتا رہا، پھونک پھونک کر قدم رکھنے کے باوجود اس نے کئی دفعہ ٹھوکر کھائی اور گرتے گرتے بچا۔ بار بار اس کی ٹانگیں لرزنے لگتیں اور کندھے بوجھ محسوس کرنے لگتے لیکن ماں کی محبت اسکی ہمت

بندھاتی اور وہ چلتا چلتا اگلے پڑاؤ تک پہنچ گیا۔

یہاں انہیں کافی دیر رکنا پڑا۔اس کا خیال تھا کہ کچھ کھا پی لیں اور تھوڑا آرام بھی کر لیں تا کہ باقی کا سفر آسانی سے طے ہو جائے۔لیکن کھانے پینے سے پہلے انہوں نے آرام کرنا زیادہ مناسب جانا اور وہ آرام کرنے کے لیے پتھروں کی سلوں پر نیم دراز ہو گئے۔

اس کے باپ نے اس واقعے کا گہرا اثر لیا لیکن زبان سے کبھی بھی بیوی کو برا بھلا نہ کہا۔وہ کہا کرتا تھا کہ ناپسندیدہ شخص سے کنارہ کر لینے ہی اچھائی ہے چاہی برے طریقے سے ہی کیوں نہ کیا جائے۔

اس نے سکول جانا شروع کیا تو اس کا ذہن کئی خانوں میں بٹ گیا۔ایک خانے میں اس کا باپ تھا جو ماں بننے کی ناکام کوشش کیا کرتا تھا۔ماں بننا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔کیوں ممتا جبلی ہوتی ہے اکتسابی نہیں۔ایک خانے میں اس کی ماں تھی۔اس سایہ دار درخت کی طرح جو محبت کی دھوپ بھی مہیا کرتا ہے۔وہ تخلیاتی کردار جس کا ذکر دوسرے بچوں سے سنا کرتا تھا۔پانی پر بننے والے عکس کی طرح جس کو پکڑنے کی کوشش کی جائے تو وہ بگڑ جاتا ہے۔زمین پر پڑے ہوئے سائے کی طرح، جس سے دور بھاگیں تو وہ جان نہیں چھوڑتا اور اگر اس کے پیچھے پڑیں تو ہاتھ نہیں آتا۔ایک خانے میں اس کے دوست تھے جن کی نظریں اس سے اس کی ماں کا پتا پوچھتی رہتی تھیں۔ایک خانے میں اس کے اساتذہ تھے جو بچوں کو سماجی مقام کے ترازو میں تولتے تھے۔ایک خانے میں محلے کی عورتیں تھیں جو وقتاً فوقتاً اس سے پوچھتیں کی اس ماں کی یاد آتی ہے یا نہیں۔

اب انہیں بھوک محسوس ہو رہی تھی۔اس کا خیال تھا کہ زیارت سے واپسی پر کہیں بیٹھ کر کھانا کھائیں گے جب کہ والدہ کے اصرار پر اس نے پوٹلی کھولی اور دونوں نے دو دو لقمے حلق سے اتارے۔اس کی والدہ نے کہا کہ اسے اپنی پروا نہیں لیکن بیٹے کی بھوک برداشت نہیں کر سکتی، اولاد بوڑھی بھی ہو جائے والدین کے لیے ان کی عمر تین چار سال سے زیادہ نہیں ہوتی۔

اس نے خاموش آواز میں کہا'' بھوک صرف پیٹ ہی کی تو نہیں ہوتی، زندگی کا ہر پہلو بھوک محسوس کرتا ہے۔تم سے میرے کون سے پہلو کی بھوک کا احساس کیا؟

نفسیاتی بھوک کا؟

معاشرتی بھوک کا؟

جذباتی بھوک کا؟

یا پھر عزت کی بھوک کا؟

تم نے میری عزت نفس چھین لی، تم نے میری آزادی چھین لی، میں اعتماد کے ساتھ باہر نہیں نکل سکتا تھا، میں جسمانی طور پر طاقت ور ہونے کے باوجود ہر کسی سے کم زور تھا، میں ذہین طالب علم ہونے کے باوجود اپنے ہم مکتبوں کے پیچھے بیٹھتا تھا، میں احساس کم تری کا شکار تھا، اور یہ سب کچھ تمہاری وجہ سے تھا، ماں، یہ سب تمہاری وجہ سے تھا، تم نے جنت کو پاؤں تلے روند دیا، کیوں؟

تم نے ایسا کیوں کیا؟

''اس کے ہاتھ لرزنے لگے، اس کی آنکھوں کے گوشے جلنے لگے، اس کی سانسیں تیز ہونے لگیں، اس کے کانوں میں ان لوگوں کی آواز گونجنے لگی جنھوں نے اس کی ماں کی وجہ سے اس سے اظہار ہم دردی کیا تھا۔ ان لوگوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں جو کھری کھری کہنے کے عادی تھے، ان لوگوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں جو اکثر اسے اس کی اوقات بتایا کرتے تھے۔ ان آوازوں گونج اتنی شدید تھی کہ اس کے کانوں کے پردے پھٹنے لگے۔ ان کی آواز پوری فضا میں گونج رہی تھی۔ ان کی آواز اردگرد کے پتھر تک سن رہے تھے، اس نے خوف اور شرمندگی سے پتھروں کی طرف دیکھا جو اس پر ہنس رہے تھے۔

ماں نے چلنے کا حکم دیا تو ہر چیز ٹھہر گئی، تمام آوازیں خاموش ہو گئیں۔ اس ماں کو اٹھایا اور سفر شروع کر دیا۔ اگلا پڑاؤ درگاہ کا احاطہ تھا۔ درگاہ کے بارے روایت مشہور تھی کہ یہاں ایک بزرگ نے قیام کیا تھا اور بہت سے چلوں اور ریاضت کے بعد صاحب کرامت ہو گیا۔ لوگ اس کے پاس دعائیں کرانے آتے اور اطمینان قلب لے کر لوٹتے۔

پھر اچانک وہ بزرگ غایب ہو گئے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ وہ زمین میں سما گئے تھے۔ کچھ نے دیکھا تھا کہ سفید لباس والی چند ہستیاں انہیں اپنے ساتھ آسمانوں میں لے گئیں۔ پھر آس پاس کی بستیوں کے عقیدت مندوں نے ان کی قبر کا نشان بنا کر اس کے گرد مختصر سی عمارت بنا دی۔ اب وہ عمارت وسیع و عریض مقبرے میں تبدیل ہو چکی ہے اور درگاہ کے نام سے مشہور ہے۔

اس کی ماں نے دعا مانگی اور کافی دیر آنکھیں بند کر کے بیٹھی رہی۔ وہ بھی ماں کے سامنے بیٹھ اس راستے کر طرف دیکھتا رہا جس پر چل کر وہ آئے تھے۔ جس جگہ پر درگاہ کی عمارت تھی وہ جگہ بلندی پر تھی، ایک طرف پہاڑ کی عمودی دیوار تھی اور

دوسری طرف گہرے کھائی تھی جس کے کنارے پر تین فٹ اونچی دیوار تھی جو راستے تک تعمیر کی گئی تھی۔

اس نے تعلیم خیر باد کہہ کر عملی زندگی میں قدم رکھا تو اس کے والد نے عملی زندگی سے قدم کھینچ کر خود کو گھر تک محدود کر لیا۔ باپ نے اسے خود کفیل کر کے اپنا فرض پورا کر دیا تھا۔ اس کا باپ ایک مضبوط فصیل میں قید تھا۔ اس نے کبھی کسی کو داخلی کیفیات سے آگاہ نہیں کیا اور ایک دن اسی حصار کے اندر گم ہو گیا۔

والد کی وفات کے بعد وہ بالکل تنہا رہ گیا۔ اس نے کوئی دوست نہیں بنایا تھا یا پھر کسی نے اسے دوست نہیں بنایا۔ اس نے کبھی شادی کا بھی نہیں سوچا کیوں کہ ہر عورت میں اسے ماں کی جھلک نظر آتی تھی۔

دعا سے فارغ ہو کر اس کی ماں نے واپسی کا ارادہ ظاہر کیا۔ ماں کی خواہش پوری ہو چکی تھی، اس کے ذہن کا بوجھ اتر چکا تھا۔ اس کا ذہن ہلکا پھلکا ہو چکا تھا۔ اس نے ماں کو کندھوں پر بٹھایا اور دیوار کے ساتھ ساتھ راستے پر چلنے لگا۔

اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے کندھوں پر بوجھ زیادہ ہو رہا ہو، اس کے قدم ہلکے سے لڑکھڑائے۔

''بوجھ کیوں بڑھ رہا ہے'' اس نے سوچا۔

اس کی ٹانگوں کی لرزش زیادہ ہونے لگی، اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے اس کا جسم کمزور ہو رہا ہو، اس کے کانوں کی لویں تپنے لگیں، اردگرد کی ہر شے کپکپانے لگی، اس کے گھٹنوں میں خم آنے لگا، بوجھ بڑھتا جا رہا تھا، یہ بوجھ اس کے جسم اور ذہن کو کچلے جا رہا تھا، اس کے گلے کی رگیں ابھرنے لگیں، اس کی آنکھوں کی رنگت سرخ ہونے لگی، اس کے خون کا دباؤ نا قابل برداشت ہو رہا تھا، اسے یوں لگا جیسے اس کا جسم دھماکے سے پھٹنے والا ہے، اس کے جسم اور ذہن پر ہزاروں من وزن تھا، اس کا جسم اس بوجھ کو برداشت نہیں کر پا رہا تھا۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اچانک اس نے چیخ ماری اور کندھوں پر لدے بوجھ کو کھائی میں پھینک دیا۔۔۔۔

جسمانی بوجھ کے اترتے ہی اس کا ذہن پر کی طرح ہلکا ہو گیا۔۔۔۔۔۔ پھر اس نے دھاڑیں مار مار کر رونا شروع کر دیا۔

مفرور

رعایا کی تمام انواع نے اپنا اپنا نمائندہ چنا اور بادشاہ کے دربار میں بھیج دیا۔ آج ان کو ایک اہم مسئلے پر غور و فکر کرنے کے لیے بلایا گیا تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ کافی عرصے سے اس ملک کے افراد غایب ہو رہے تھے رعایا کم سے کم ہوتی جا رہی تھی، جنگل خالی ہو رہا تھا اور دور دور تک ویرانی ہی ویرانی نظر آنے لگی تھی۔ بادشاہ چاہتا تھا کہ اس معاملے کی چھان بین کی جائے اور پتا چلایا جائے کی ان کے ساتھی کہاں جاتے ہیں اور کیوں جاتے ہیں۔

چند دن پہلے لکڑی ہارے نے خبر دی تھی کہ ہمارے علاقے سے کافی فاصلے پر ایک عجیب سا ملک ہے۔ وہاں ایسے جان ور رہتے ہیں جو پچھلی ٹانگوں پر چلتے ہیں اور خود کو سیدھا رکھنے پر قادر ہیں۔ ان اجسام مختلف رنگوں کے ہیں اور وہ بار بار اپنی جلد کی رنگت تبدیل کر لیتے ہیں۔ ان کا رہن سہن اور کھانے پینے انداز مختلف ہیں، انہوں نے اپنے گھر مصنوعی غاروں میں بنا رکھے ہیں جو زمین کی سطح سے بلند ہیں۔ یہ خبر نہایت سنسنی خیز تھی اور تمام انواع چاہتی تھیں کہ اس ملک کے بارے مزید معلومات حاصل کی جائیں۔ ہوسکتا ہے کہ ان کے گم شدہ افراد کا تعلق اس ملک سے ہی نکل آئے۔

طے یہ ہوا کہ چند افراد کو اس کام کے لیے متعین کیا جائے کہ اس ملک میں جائیں اور معلومات لے کر آئیں۔

چند زیرک اور چست و چالاک افراد چن کر اس ملک کی طرف روانہ کر دے گئے۔ لیکن وہ افراد بھی لوٹ کر نہ آئے۔ آج پھر اعلان ہوا کہ تمام انواع کا ایک ایک فرد بادشاہ کے دربار میں آئے تا کہ اس مسئلے کا حل تلاش کیا جائے۔

ساری انواع کا ایک ایک فرد بادشاہ کے دربار میں حاضر تھا۔ لکڑ ہارا آج پھر ایک خبر لے کر آیا تھا۔ اس نے خبر دی کہ ہمارے افرد کی گم شدگی کا تعلق اسی عجیب ملک سے ہے۔ ہمارے افرد اس ملک میں جا کر اپنی جون بدل لیتے ہیں اور

انہیں جیسے ہو جاتے ہیں۔ہم نے جو افراد ان کی خبریں لانے کے لیے متعین کیے تھے وہ وہیں کے ہو کر رہ گئے ہیں اور واپس نہیں آنا چاہتے۔انہوں اپنا رہن سہن انہی جیسا بنا لیا ہے اور پچھلی ٹانگوں پر چلنا شروع کر دیا ہے۔وہ اس طرح ان میں گھل مل گئے ہیں کہ ان کی پہچان بھی مشکل ہے۔

دربار میں شور سن کر بادشاہ نے اپنی گردن باہر نکالی اور تفصیلات کے لیے حکم دیا۔سارا ماجرا سننے کے بعد اس نے بوڑھے وزیر کی طرف دیکھا جو ایک درخت کی کھوہ میں آنکھیں بند کر کے کسی اہم مسئلے پر غور کر رہا تھا۔بادشاہ کے بلانے پر وزیر نے تین دفعہ ہو ہو کی آواز نکالی اور دربار کے وسط میں آن بیٹھا۔

اس نے سارا ماجرا سنا اور تھوڑی دیر کے آنکھیں بند کر کے سوچ کر بڑے تحمل سے کہنے لگا کہ ان کو یقیناً واپس آنا چاہیے لیکن ان کی پہچان کیسے ہو گی؟ انہوں نے تو اپنی جون بدل لی ہے اور انہیں جیسے ہو گئے ہیں۔انہی جیسا رہتے سہتے ہیں، انہی جیسا کھاتے پیتے ہیں، انہی کی طرح جلد کی رنگت تبدیل کر لیتے ہیں!

بادشاہ نے گردن اٹھائی اور دربار کی چھت پر لٹکے اسود چوکی داروں سے مشورہ طلب کیا۔انہوں نے دربار کے چند چکر لگائے اور اپنا نمائندہ مشورے کے لیے بادشاہ کے قریب اتار دیا۔اس نے اندازے سے بادشاہ کی طرف چہرہ کیا اور کہنے لگا۔

''بادشاہ سلامت! ہمارے افرد نے یقیناً ان جیسا روپ اپنا لیا ہے اور ظاہری طور پر ان جیسے ہو گئے ہیں لیکن، سرکار، وہ اپنی خصلتیں تبدیل کرنے پر قادر نہیں ہیں، آپ وزیر محترم کو بھیجیں جو ان کے خصائل سے انہیں پہچان جائیں گے اور ان ساتھ سری قوتوں کا قافلہ ہو جو سائے کی صورت میں ہے، جو ان کی جون تبدیل کر دے گا۔نادیدہ جال ان پر پھینک کر انہیں گھسیٹ کر یہاں لے آئیں گے۔

وزیر، نادیدہ جال اور سری قوتوں کے ہمراہ اس عجیب ملک کی طرف چل دیا۔

قافلہ چند افراد کے گروہ کے پاس پہنچا جو بڑے شائستہ انداز میں کسی اہم موضوع پر گفتگو کر رہے تھے۔بات چیت کرتے ہوئے ہلکے پھلکے انداز میں مسکرا رہے تھے۔آہستہ آہستہ ان کی مسکراہٹ میں کمی آنے لگی، ان کے چہروں پر سنجیدگی چھانے لگی، ان کے لہجوں میں جوش آنے لگا اور ان کی آوازیں درشت ہونے لگیں۔تھوڑی دیر کے بعد وہ زور زور سے بولنے لگے اور اپنی اپنی نشست پر کسمسانے لگے۔ایک فرد بات کر رہا ہوتا تو دوسرا اس کی بات سننے کی بجائے خود بولنے لگتا، پہلا اپنی بات اور شدت سے سنانے کی کوشش کرنے لگتا۔دیکھتے ہی دیکھتے محفل میں موجود تمام

افرد اپنی آواز دوسرے کی آواز سے بلند کرنے کی کوشش میں لگ گئے۔ پھر اچانک ان میں سے ایک اٹھا اور دوسرے کی کھال گردن کے قریب سے پکڑ لی، دوسرے نے پہلے کے سر کی سفید کھال کو نوچا اور اس کے سر سے الگ کر دی۔ یہ دیکھ کر پاس بیٹھے ہوئے دوسرے افراد بھی اٹھ کھڑے ہوئے اور ایک دوسرے سے لڑنے لگے۔ ان کے گلوں سے بے معنی آوازوں کا شور نکل رہا تھا اور ایک دوسرے کو نوچ کھسوٹ رہے تھے۔ وزیر کو پتا چل گیا کہ یہ ان کے مفرور افراد ہیں۔ اس نے سری قوتوں کو ان پر مسلط کر دیا تا کہ ان کی اصل جون میں لائیں۔

وزیر نے سری قوتوں کو اشارہ کیا، انہوں نے ان افراد کے ذہنوں کے گرد گھیرا تنگ کر لیا۔

ان افراد کی آوازوں میں تبدیلی آنا شروع ہو گئی، بے معنی آوازیں غراہٹ میں بدلنا شروع ہو گئیں، ان کی باچھیں پھیل کر کانوں کی طرف جانا شروع ہو گئیں، دانت نظر آنے لگے، کمر جھک گئی اور رنگین کھال کھسک کر اتر گئی۔ ان کے جسموں پر موجود بالوں کی مقدار اور طوالت میں اضافہ ہونے لگا، اگلی ٹانگیں زمین سے جا لگیں اور دمیں ظاہر ہونے لگیں۔ جون بدل گئی، ان پر جال ڈال کر باندھ دیا گیا اور اسود چوکی داروں کو بلا کر ان کے حوالے کر دیا گیا۔

اب قافلہ ایک بلند و بالا غار میں پہنچا۔ غار کے بہت سارے حصے تھے، ہر حصے کا دہانہ لکڑی کے تختوں سے بند کر دیا گیا تھا۔ سری قوتیں ایک درز میں سے گذر کر اندر گئیں اور دیکھا کہ اندر پانچ جان ور تھے۔ چار کا حلیہ ملتا جلتا تھا پانچویں کی فرد کی صورت قدرے مختلف تھی۔ چار افراد کی کھالیں قریبا ایک جیسی تھیں اور ان کے سروں پر ایال چھوٹی تھی جب کہ پانچویں کی کھال مختلف رنگوں پر مشتمل تھی اور اس کے سر پر اون بھی لمبی تھی۔

چھوٹے بالوں والے جان ور لمبے بالوں والے جان ور کے پاس بیٹھ جاتے اور اگلے پنجوں سے اس کی جسم کو چند مقامات پر رگڑتے۔ تھوڑی دیر بعد چھوٹے بالوں والا ایک جان ور اٹھا اور لمبے بالوں والے جان ور کی کھال کھینچ کر اتارنا شروع کر دی۔ اس کے بعد اس نے اپنی کھال بھی کھینچ ڈالی اور لمبے بالوں والے جانور سے لپٹ گیا۔ غور کرنے پر پتا چلا کہ انہوں نے بقائے نوع کا عمل شروع کر دیا ہے۔ سری قوتوں کی حیرانی تب عروج پر پہنچ گئی جب انہوں نے دیکھا کہ یہی عمل باری باری چھوٹے بالوں والے سارے جان وروں نے ایک ہی جان ور سے کیا تھا۔ وزیر کو مطلع کیا گیا تو اس نے پہچان لیا۔ اس نے سری قوتوں کو ان پر مسلط کر دیا تا کہ ان کی اصل جون میں لائیں۔ وزیر نے سری قوتوں کو اشارہ کیا، انہوں نے ان افراد کے ذہنوں کے گرد گھیرا تنگ کر لیا۔

ان جان وروں کے جسم پر بڑے بڑے سخت بال اگنے شروع ہو گئے، کمر جھکنے لگی، اگلی ٹانگیں زمیں پر لگ گئیں، چھوٹی

چھوٹی دمیں ظاہر ہونا شروع ہو گئیں، گردنیں سخت کھال سے ڈھک گئیں، منہ کے دہانے سے چوڑی تھوتھنی پیدا ہونے لگی۔ جون بدل گئی، ان پر جال ڈال کر باندھ دیا گیا اور اسود چوکی داروں کو بلا کر ان کے حوالے کر دیا گیا۔

قافلہ کافی دنوں تک جان وروں کے ایک گروہ کی حرکات وسکنات، افعال اور کردار کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ جان ور اپنی ہی نوع کو مختلف طریقوں سے اذیت پہنچاتے تھے۔ وہ بغیر کسی اپنے فائدے یا نقصان کے دوسرے افراد کو جسمانی، ذہنی اور معاشرتی طور پر تکلیف دینے کی کوشش کرتے۔ یہ ان کی عادت لگتی تھی اور اس عادت کے پیچھے حسد کا جذبہ۔ وزیر کو پتا چل گیا کہ یہ ان کے مفرور افراد ہیں۔ اس نے سری قوتوں کو ان پر مسلط کر دیا تاکہ ان کی اصل جون میں لائیں۔ وزیر نے سری قوتوں کو اشارہ کیا، انہوں نے ان افراد کے ذہنوں کے گرد گھیرا تنگ کر لیا۔

ان کی ہیت میں تبدیلی آنا شروع ہو گئی، ان کی کھالیں زردی مائل سبز ہونے لگیں، اگلی ٹانگیں مڑ کر ان کے ان کے سامنے آ گئیں، کمر جھک گئی اور پیٹ زمین پر لگ گیا، ایک دم نمودار ہوئی جو اوپر سے کمر کی جانب مڑ گئی، پہلوؤں سے دونوں جانب چار چار ٹانگیں نمودار ہوئیں اور وہ ادھر ادھر رینگنے لگے اور جا بجا ڈنگ مارنے لگے۔ جون بدل گئی، ان پر جال ڈال کر باندھ دیا گیا اور اسود چوکی داروں کو بلا کر ان کے حوالے کر دیا گیا۔

اب قافلے کی نظر چند افراد پر تھی جو مختلف مقامات پر بکھرے ہوئے تھے۔ ان کے پاس کسی نہ کسی نوعیت کی طاقت تھی۔ کوئی جسمانی طور پر طاقت ور تھا تو کوئی معاشرتی طور پر، کوئی سیاسی طاقت رکھتا تھا تو کوئی معاشی۔ ان سب میں ایک قدر مشترک تھی کہ وہ اپنی طاقت کے نشے میں کمزوروں کا خیال ہی نہیں کرتے تھے، طاقت میں بدمست ہو کر چلتے تو کمزوروں کو روندتے چلے جاتے۔ لگتا تھا کہ انہیں افراد نظر ہی نہیں آتے، اور اگر آتے بھی تو ان کی پروا نہ کرتے۔

وزیر کو پتا چل گیا کہ یہ ان کے مفرور افراد ہیں۔ اس نے سری قوتوں کو ان پر مسلط کر دیا تاکہ ان کی اصل جون میں لائیں۔ وزیر نے سری قوتوں کو اشارہ کیا، انہوں نے ان افراد کے ذہنوں کے گرد گھیرا تنگ کر لیا۔ ان کی ہیت میں تبدیلی آنا شروع ہو گئی۔ ان کے جسم پھیلنا شروع ہو گئے، ناکیں لمبی ہو کر زمین تک لٹک گئیں، کمر جھک گئی، چھوٹی دمیں ظاہر ہونا شروع ہو گئیں اور وہ جوش سے چنگھاڑنے لگے۔ جون بدل گئی، ان پر جال ڈال کر باندھ دیا گیا اور اسود چوکی داروں کو بلا کر ان کے حوالے کر دیا گیا۔

آہستہ آہستہ اس عجیب ملک میں آبادی کم ہوتی گئی، یہاں تک کہ کہیں کہیں کوئی خوف زدہ باشندہ نظر آتا۔ اونچے اونچے مصنوعی غار خالی ہو گئے اور ہر طرف ویرانی کا راج ہو گیا۔

قافلے والے ایک غار کی چھت پر بیٹھے سوچ رہے تھے اس ملک کے اصل باشندے کہاں گئے، کیا یہاں بسنے والے زیادہ تر افراد انہی کے ساتھی تھے جو جون بدل کر رہ رہے تھے؟؟؟

لیکن ان سوالوں کا ان کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

اصیل مرغ

تالاب کے قریب خالی جگہ پر کافی لوگ جمع تھے۔دو پہر ڈھل چکی تھی،فضا میں حرارت کی شدت قدرے کم ہوگئی تھی اور پٹوار خانے کی مشرقی دیوار کا سایہ پھیلتا جارہا تھا۔پٹوار خانے کے شمال میں چوراہے پر ایک سبزی والے کی ریڑھی تھی۔چوراہے کے ایک طرف کریانے کی دوکان تھی جہاں سے اسپرین کی گولیوں سے لے کرمٹی کا تیل تک مل جاتا تھا۔پٹوار خانے کی مغربی دیوار مسجد سے ملحق تھی۔گاؤں اکثر بوڑھے دوپہر گذارنے کے ساتھ ساتھ ظہر اور عصر کی نماز بھی پڑھ لیا کرتے تھے اور عصر کی نماز کے بعد پٹوار خانے کی مشرقی دیوار کے سائے میں صف بچھا کر بچوں اور نوجوانوں کو اچھی زندگی گذارنے کے گر بتایا کرتے تھے۔یہ جگہ گاؤں کا ثقافتی مرکز تھی۔لڑکے گلی ڈنڈا کھیلتے تھے جب کہ بزرگ پاشا کی بساط بچھا کر،گلی ڈنڈے کے نقصانات بتا کران کی کھیل بند کروادیا کرتے تھے اور عبرت کے لیے سائیں ولی محمد کی مثال دی جاتی جس کی آنکھ گلی لگنے سے ضائع ہوگئی تھی۔

سائیں ولی محمد گاؤں میں ایک اہم شخصیت تھا جس کے عجیب وغریب شوق تھے۔اس کی عمر پچاس اور ساٹھ کے درمیان تھی اور صحت کافی اچھی تھی۔کوئی تیس پنیتیس سال قبل گلی لگنے سے اس دائیں آنکھ ضائع ہوگئی تھی۔بائیں ہاتھ کی پہلی اور دوسری انگلیوں کی ایک ایک پور چارا کاٹنے والے ٹوکے میں آکر کٹ گئی تھی۔چالیس سال کی عمر شادی ہوئی اور چند برس بعد اللہ نے بیٹا عطا کیا جس کا نام حمید سائیں رکھا گیا۔حمید خاموش طبع بچہ تھا اور ہر چیز کو گہری نظروں سے دیکھتا رہتا تھا۔

ولی کے شوق بہت عجیب تھے جن میں ایک شوق تھا مرغے لڑانے کا۔اس کے پاس دو اصیل مرغے تھے جو اس نے

صرف لڑانے کے لیے پال رکھے تھے۔شادی سے پہلے ولی بہت سے علاقوں میں زندگی گذار چکا تھا۔اس کے مطابق مرغے لڑانے کا شوق اسے جہلم کے علاقے سے ملا تھا۔اس کا کہنا تھا کہ وہ اس گاؤں میں رہتا تھا جہاں سکندر اعظم پہنچا تھا اور اسی جنگ جو بادشاہ کی برکت سے اس گاؤں کے لوگوں میں پرندوں کی لڑائی کرانے کا جذبہ پیدا ہو گیا تھا۔اس گاؤں آئے دن مرغ، بٹیر اور تیتر کی لڑائی کے مقابلے منعقد کرائے جاتے تھے۔

اس گاؤں میں جہلم کے علاقے جیسا شوق تو نہیں تھا لیکن چند ایک لوگ کبھی کبھار اس قسم کے مقابلے کا انعقاد کرا ہی دیتے۔

آج شام سے پہلے ولی محمد اور استاد منظور کے مرغوں کا مقابلہ تھا۔لوگ پٹوار خانے کے پاس جمع تھے جن میں کچھ مقابلے کا انتظار کر رہے تھے۔استاد منظور اپنے جان ور کے ساتھ موجود تھا جب کہ سائیں ولی محمد گھر میں اپنے جان ور کو بادام کی گریاں کھلا رہا تھا۔تھوڑی دیر بعد ولی محمد اپنے بیٹے کے ہم راہ آن پہنچا۔جب دیوار کے سائے نے اپنی ٹانگیں تالاب کے کنارے تک پسار لیں تو مقابلے کا آغاز ہوا۔

دونوں جان وروں کو آمنے سامنے کھڑا کر دیا گیا۔لوگ اردگرد دائرے کی شکل میں پھیل گئے، کچھ کھڑے ہو کر اور کچھ صف پر بیٹھ کر۔ولی محمد کے ساتھ اس کا بیٹا بھی تھا جو بڑے غور سے مرغوں کو دیکھ رہو تھا۔

دونوں سپاہی آمنے سامنے کھڑے ایک دوسرے پر حملہ کرنے کے لیے پر تول رہے تھے۔ولی محمد کا مرغا، جس کا نام لال بادشاہ تھا، استاد منظور کے مرغے سے قد میں بڑا تھا۔استاد منظور کے جان ور کا نام ٹامی تھا۔لال بادشاہ اور ٹامی ایک دوسرے کے قریب آئے، اچھلے اور ایک دوسرے پر پل پڑے۔لال بادشاہ نے پر پھڑ پھڑائے اور پروں کے زور سے ٹامی کو پیچھے دھکیل دیا۔ٹامی نے ہزیمت محسوس کرتے ہوئے اچھل کر دونوں ٹانگیں دائیں بائیں سے لال بادشاہ کے سر پر مارنے کی کوشش کی۔اس کا یہی حملہ بہت شدید تھا اور اگر اس کی چال کامیاب ہو جاتی تو شاید لال بادشاہ کی آنکھ ضایع ہو جاتی۔لال بادشاہ اس حملے سے بوکھلا کر تھوڑا سا پیچھے ہٹ گیا۔ولی محمد اور منظور اپنے اپنے مرغے کا نام لے کر ان کی حوصلہ افزائی کر رہے تھے۔اردگرد کھڑے لوگ بھی کافی پر جوش ہو رہے تھے۔اچانک کسی نے ہانک لگائی، صوبے دار صاحب آ گئے! ریڈیو بھی لائے ہیں! ریڈیو آ گیا!

لوگوں کی توجہ مرغوں سے ہٹ کر صوبے دار کی طرف ہو گئی اور مرغوں کا مقابلہ بند کروانا پڑا۔

صوبے دار صاحب کبھی فوج میں تھے، فوج میں ان کا جو بھی عہدہ تھا یہاں انہیں سب صوبے دار ہی کہتے تھے، اور ایک

سال تک انگریزوں کی طرف سے کسی محاذ پر لڑ چکے تھے۔ ٹانگ زخمی ہونے کی وجہ سے فوج سے فارغ ہونا پڑا، تب سے قریبی قصبے میں رہائش پذیر تھے اور پنشن پر بہت اچھا گذارا کر رہے تھے۔ اس گاؤں میں ان کی بچی کی شادی ہوئی تھی اور وہ اکثر اس سے ملنے آجایا کرتے تھے۔ ان کے آنے گاؤں کے لوگ بہت خوش ہوتے تھے، اس خوشی کی وجہ ایک تو ان کی دل چسپ باتیں اور دوسرا ان کا ریڈیو تھا جس پر گانے لگتے اور خبریں بھی آتی تھیں۔ صوبے دار صاحب صف پر درمیان میں بیٹھ گئے اور سلام دعا کے چند جملوں کے بعد چھوٹوں اور بڑوں کی دلی خواہش کے مطابق ریڈیو چلا دیا گیا۔ شام تک سب ریڈیو اور صوبے دار صاحب کی باتیں سنتے رہے۔ شام ہوئی تو لوگوں نے صوبے دار صاحب سے دو تین دن رہنے کا وعدہ لیا اور اپنے اپنے گھروں کو چل دیے۔

سائیں ولی محمد نے بغل میں مرغا دبایا اور بیٹے کی انگلی پکڑ کر اپنے گھر آ گئے۔ کھانا کھاتے ہوئے حمید نے ولی محمد سے پوچھا، ''ابا! آپ مرغے کیوں لڑاتے ہیں؟

''مجھے شوق ہے، پترا'' ولی نے سادگی سے جواب دیا۔

''لیکن لڑائی تو اچھی بات نہیں ہے! آپ خود ہی کہتے ہیں کہ کسی سے لڑنا اچھی بات نہیں ہے'' حمید نے کھانے سے ہاتھ کھینچ کر کہا۔

''ہاں، لیکن مرغے لڑانے میں کوئی حرج نہیں ہے، وہ کون سا انسان ہوتے ہیں۔''

''ابا! جب مرغے ایک دوسرے کو چونچ مارتے ہیں اور کنڈے مارتے ہیں تو انہیں درد نہیں ہوتا؟''

''درد؟''

''ہاں ہوتا تو ہے لیکن کم ہوتا ہے، وہ جان ور ہیں نا، جان وروں کو انسانوں جتنا درد نہیں ہوتا۔'' ولی محمد نے غیر یقینی انداز میں کہا اور حمید کو کھانے کی طرف دھیان دینے کے لیے کہا۔

حمید نے ایک دو لقمہ لیا اور پھر کہنے لگا، ''ابا! مرغے ایک دوسرے کے دشمن ہوتے ہیں؟''

''نہیں پتر! وہ تو جان ور ہیں انہیں کیا پتا کہ دشمنی کیا ہوتی ہے''

''تو پھر وہ لڑ کیوں پڑتے ہیں؟'' حمید نے حیرانی سے پوچھا۔

''پتر وہ اپنے مالکوں کی خاطر لڑتے ہیں۔ ان کے کہنے پہ لڑتے ہیں۔ ہم انہیں بادام کھلاتے ہیں، انہیں پیار سے پالتے ہیں، انہیں صاف ستھرا دانہ دنکا دیتے ہیں، اس لیے وہ ہمارے لیے لڑتے ہیں۔''

حمید کو باپ کی بات پوری طرح سمجھ نہ آئی اور وہ خاموشی سے کھانا کھانے لگا۔

اس رات حمید خواب میں بھی مرغوں کی لڑائی ہی دیکھتا رہا۔اس نے دیکھا کہ اس کے پاس ہزاروں کی تعداد میں مرغے ہیں،وہ ایک میدان میں کھڑا ہے،اس کے آگے قطاروں کی شکل میں مرغے کھڑے ہیں۔میدان کے دوسرے کنارے اس کا دوست نواب اپنے مرغوں کی قطاریں بنوا کر اسے للکار رہا ہے۔پھر مرغوں کی فوج ایک دوسرے پر پل پڑتی ہے،ایک دوسرے کو چونچوں اور کنڈوں سے زخمی کرنے لگتے ہیں۔حمید اور نواب اپنے اپنے مرغوں کو تعریفی نظروں سے دیکھتے ہیں اور انہیں جوش دلاتے ہیں۔پھر اس نے دیکھا کہ وہ اپنے گھر کی چھت پر مرغوں کو دانہ دنکا اور بادام کی گریاں کھلا رہا ہے،قریب پڑی چارپائی ریڈیو کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور اس پر مرغوں کی لڑائی کی خبر آ رہی ہوتی ہے۔حمید خبریں سن سن کر خوش ہوتا ہے کیوں کہ خبروں میں اس کے مرغوں کی کامیابی کا ذکر ہو رہا ہوتا ہے۔تھوڑی دیر بعد باہر سے نواب اور استاد منظور آ جاتے ہیں جنہوں نے فوجی لباس پہنا ہوا ہوتا ہے وہ اس کے گلے ملتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کل پھر مقابلہ ہوگا۔پاس کھڑے مرغے بولنے لگتے ہیں کہ ہم کل صوبے دار سے لڑیں گے۔اس کے بعد مرغے اپنی آواز میں بولنا شروع کر دیتے ہیں۔اس آواز کے ساتھ ہی اس کی آنکھ کھل گئی۔یہ ان کے اصیل مرغوں کی آواز تھی۔اس کا باپ ابھی سو رہا تھا۔حمید اٹھا اور مرغوں کے ڈربے کا پاس چلا آیا۔اس نے ڈربہ کھولا اور ایک مرغے کو باہر نکال کر اپنے سامنے کھڑا کر لیا۔وہ اسے دیکھتا رہا اور سوچتا رہا کہ یہ مرغا کیوں لڑتا ہے،کیا یہ اس لیے لڑتا ہے کہ اس کا مالک اسے اچھی خوراک اور بادام کی گریاں کھلائے گا؟

کیا اس مرغے کو کسی بھی مرغے سے لڑایا جا سکتا ہے؟ چاہے وہ اس کا دشمن ہو یا نہ ہو؟ اور چاہے اس نے اسے پہلی بار ہی کیوں نہ دیکھا ہو؟

حمید کے ذہن میں اس قسم کے سوالات اٹھتے رہے جن کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

آج سہ پہر یہ طے پایا کہ استاد منظور اور ولی محمد کے مرغوں کا مقابلہ نہیں ہوگا بل کہ صوبے دار صاحب سے جنگ کے واقعات سنے جائیں گے۔

صوبے دار صاحب بھی آ گئے۔تھوڑی دیر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں پھر کسی کی رسمی یاددہانی پر صوبے دار صاحب نے کہا کہ آج وہ برما کے جنگلات میں ہونے والے ایک معرکے کا قصہ سنائیں گے۔

حمید صوبے دار صاحب کے قریب ہی دائیں جانب بیٹھا ہوا تھا۔صوبے دار صاحب کہنے لگے:

''انگریز ہمیں فوج میں جبری بھرتی کر کے برما کے جنگلات میں لے گئے۔ وہاں جا کر ہمیں پتا چلا کہ ہم جاپانی فوجیوں کے خلاف لڑیں گے۔''

حمید کے ذہن میں اچانک رات والا خواب تیرنے لگا۔

''ہم تربیت یافتہ تو تھے نہیں کہ ہمیں سیدھا معرکے میں بھیج دیا جاتا، ہمیں فوجیوں کے لیے خوراک کی فراہمی کا کام سونپا گیا۔ لیکن خطرہ تو بہر حال تھا ہی، اس لیے ہمیں ایک ایک بندوق بھی پکڑا دی گئی جس کے سرے پر برچھی لگی ہوئی تھی۔ ایک صبح ہم خوراک سے بھری بہنگیاں کندھوں پر لٹکائے ایک انگریز سپاہی کے آگے آگے چل رہے تھے کہ درختوں کے جھنڈ میں سے ہم پر حملہ ہو گیا۔ حملہ آور چھوٹے چھوٹے قد کے تیس پینتیس جوان تھے جن کی ناکیں بیٹھی ہوئی اور آنکھیں چھوٹی چھوٹی تھیں۔ ان کے پاس بندوقیں نہیں تھیں بل کہ ڈنڈے تھے جن کے سروں پر برچھیاں لگی ہوئی تھیں۔''

حمید کے سامنے رات والی صفیں گھومنے لگیں۔

''انگریز سپاہی جو کہ ہمارا کمان دار تھا، کہنے لگا، آج تمہاری مردانگی کا امتحان ہے، یہ سب تمہارے دشمن ہیں، ان کو ختم کر دو، اگر تم نے انہیں مار دیا یا بھگا دیا تو کرنل صاحب تم سب کو بیس بیس روپے اور ولائتی شراب کی ایک ایک بوتل دیں گے۔ ہم سب پر جوش ہو گئے اور بندوقیں سنبھال کر دشمنوں پر پل پڑے۔ ہمیں بندوق چلانا تو آتا نہیں تھا، ہم نے بندوقوں کو ڈنڈوں کی طرح استعمال کرنا شروع کر دیا۔ ہمارا کمان دار انگریز سپاہی ایک درخت پر چڑھ کر ہمیں جوش دلا رہا تھا۔ ہم ایک دوسرے کو برچھیوں اور بندوقوں کے دستوں سے زخمی کر رہے تھے۔''

حمید اس منظر کا موازنہ کل والے مقابلے سے کر رہا تھا جس میں استاد منظور اور اس کا باپ اپنے اپنے مرغوں کو پکار پکار کر حملہ کرنے کے لیے اکسا رہے تھے۔

''کچھ ہمارے اور کچھ ان کے جوان زخمی ہوئے۔ میری بندوق کی ایک چوٹ سے دشمن کو تارے نظر آ جاتے تھے۔''

حمید صوبے دار صاحب کر غور سے دیکھ رہا تھا۔ اسے یوں لگا جیسے ان کی ناک استاد منظور کے مرغے سے جیسی ہے۔ ان کے بال مرغی کی کلغی لگ رہے تھے اور جب وہ بات کرتے ہوئے ہاتھ ہلاتے تو اسے یوں لگتا جیسے مرغا پر پھیلا رہا ہو۔

عین اسی وقت ایک بچہ بھاگتا ہوا آیا اور کہنے لگا کہ چاچا رشید کا بیٹا اشرف چھت سے گر گیا ہے۔ یہ سن کر رشید بوکھلا گیا اور گھر کی طرف بھاگ گیا۔ صوبے دار صاحب نے بھی قصہ ادھورا چھوڑا اور چند لوگوں کے ہم راہ رشید کے بیٹے کی

خبر گیری کے لیے چلے گئے۔

رات کو کھانا کھاتے ہوئے حمید نے ولی محمد سے کہا،''ابا! صوبے دار صاحب کی شکل کچھ کچھ چاچے منظور کے مرغے سے ملتی ہے نا؟'' ولی محمد نے قدرے ڈانٹتے ہوئے کہا،''پتر ایسا نہیں کہتے، ایک انسان کی شکل جانور سے کیسے مل سکتی ہے؟'' لیکن حمید قائل نہ ہوا، اس کا خیال تھا کہ صوبے دار صاحب اور استاد منظور کے مرغے میں کوئی فرق نہیں۔ حمید خاموشی سے کھانا کھانے لگا۔

تنبیہ

اکرام گھر میں داخل ہوا تو سب چونک کر اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اس کے بازو پر پٹی بندھی ہوئی تھی، کھردرے کپڑے کی پٹی، اور ایک باریک پٹی کا چھلا سا بنا کر گردن میں ڈالا ہوا تھا جس کو ذریعے بازو کو سہارا مل گیا تھا۔ گھر کے تمام افراد اس کے گرد اکٹھے ہو گئے اور پریشانی ان کے چہروں پر ابھرنے لگی۔ گڈی، جس کا نام فردوس تھا، بے چینی سے بار بار پوچھ رہی تھی۔

بھائی کیا ہوا بازو کو؟

کہیں گر گئے؟

کسی سے لڑائی تو نہیں ہو گئی؟

امی کی تو سسکیاں بھی سنائی دینے لگیں۔ ابا جان جو قدرے غصیلے مزاج کے تھے کہنے لگے کہ اسے بیٹھ تو لینے دو کہیں، سانس تو لینے دو، شور ہی مچا دیا ہے، سر پہ ہی چڑھ گئے ہو سب۔

اکرام سب کی سنی ان سنی کرتے ہوئے انعام سے کہنے لگا۔

نامے، شکیل باہر کھڑا ہے اسے بیٹھک میں بٹھا کر چائے پانی کا پوچھو اور میری سائیکل بھی اندر کر لینا باہر کھڑی ہے۔

انعام، جی اچھا بھائی، کہتے ہوئے باہر نکل گیا۔

اکرام آہستگی سے چلتا ہوا برامدے میں آیا اور وہاں پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔

کہاں سے چوٹ لگوائی ہے؟

ابا جی نے حسب عادت قدرے درشت لہجے میں پوچھا۔ کچھ بھی نہیں ابا جی، بس ویسے ہی، ہلکی سی چوٹ ہے۔

کارخانے میں چوٹ لگ گئی ہے۔سٹور میں گیا تھا تو بس ادھر بالا گرا بازو پر۔
ہڈی تو نہیں ٹوٹی ؟
ابا جی نے غصیلے لیکن قدرے فکر مندانہ لہجے میں پوچھا۔پتہ نہیں، لیکن چاچا نذیر کہہ رہا تھا ہڈی نہیں ٹوٹی بس داب ہے، چند دنوں میں ٹھیک ہو جائے گی۔انعام بیٹھک والے دروازے سے داخل ہوتے ہوئے بولا، بھائی، شکیل بھائی چلے گئے ہیں، کہہ رہے تھے بیٹھنا نہیں منڈی جانا ہے سبزی وغیرہ لینے۔اور یہ مالش کی شیشی بھی دی ہے انہوں نے۔
امی جی نے مالش والی شیشی پکڑ لی اور انعام سے کہا جاؤ آدھا کلو چھوٹا گوشت لے آؤ میں کامے کے لیے یخنی بنالوں جلدی سے۔اکرام اٹھا اور اندر بچھی چارپائی پر لیٹ گیا۔
سب کے چہروں پر پریشانی عیاں تھی سوائے ثانیا کے۔ثانیا کا چہرہ بے تاثر تھا بس آنکھوں میں غصے کی سرخی سی تھی۔
ثانیا امی جی کے ایک تایا زاد بھائی کی بیٹی تھی جو پانچ چھے ماہ سے ان کے گھر مقیم تھی۔اس کے یہاں قیام کا سبب یہ تھا کہ اپنی امی کی وفات کے بعد وہ گھر میں اکیلی رہ گئی تھی۔اس کے والد فوج میں صوبے دار تھے۔ثانیا اکلوتی اولاد تھی اور گھر میں اکیلی نہیں رہ سکتی تھی۔چناں چہ طے یہ پایا کہ ثانیا اپنی یا صوبے دار کی شادی تک یہاں رہے گی اور عزیز و اقارب باپ بیٹی کی لیے مناسب رشتوں کی تلاش کریں گے۔
اکرام کے بڑے بھائی، ارحام، ملک سے باہر تھے، اور ان کی بیوی دو بچوں سمیت میکے گئی ہوئی تھی۔بھائی جب سے بیرون ملک گئے تھے بھابھی سسرال میں کم ہی ٹکتی تھی اور پھر آج کل تو گرمیوں کی چھٹیوں کی وجہ سے ان کا میکے جانا ضروری تھا۔
اکرام سے چھوٹا انعام اور اس سے چھوٹی گڈی تھی جو گاؤں کے سکول میں ہی پانچویں اور چوتھی جماعت میں پڑھتے تھے۔
ابا جی کا زیادہ وقت ڈیرے پہ گذرتا تھا، امی سارا دن کام میں گذار کے تھکے ماندے وجود کو چارپائی پر پھینک کر سکون کی تلاش میں خوابوں کی دنیا میں چلی جاتیں۔ثانیا کی آمد کے بعد امی جی کی نیند کچھ بڑھ گئی تھی کیوں کہ شام کے بعد ابا جی اور اکرام کی خدمت کی ذمہ داری ثانیا نے لاشعوری معاہدے کے تحت اپنے کندھوں پر ڈال لی تھی۔
امی جی دوسری بہو کی ضرورت ارحام کے بیرون ملک جانے کے ایک ماہ بعد ہی محسوس کرنے لگی تھیں۔وہ یوں کہ اکرام نے بارھویں جماعت پاس کر کے اپنی طرف سے تعلیم مکمل کر لی تھی۔اب اس کے خیال میں قریبی قصبے کی ایک فیکٹری

میں منشی کی نوکری کرنا مزید تعلیم کی صورت میں وقت ضائع کرنے سے بہتر تھا۔ ارحام کے جانے کے بعد اس کے سسرال میں شادی بیاہ کی تقریبات اور وفاتوں کی تعداد بڑھ گئی تھی۔ اور پھر ارحام کے ساس سسر کی طبیعت بھی اکثر و بیش تر ناساز رہنے لگی تھی جس کی بنا پر بھابھی کی وہاں موجودگی کا جواز بڑھ گیا تھا۔ لہذا دوسری بہو کی تلاش زور و شور سے جاری تھی۔ رشتہ دیکھنے والے آتے جاتے تھے لیکن اکرام کا رویہ سرد مہری لیے ہوئے ہوتا جس کی وجہ پہلے تو اکرام کا شرمیلا پن تھا لیکن پچھلے ایک ماہ سے وجہ بدل گئی تھی اور اس وجہ کا علم اکرام کے علاوہ صرف ثانیا کو تھا۔

اکرام نے کھانے پینے اور تسلی لینے دینے کے بعد تھکاوٹ اور نیند کا اعلان کیا تو امی جی بھی جلدی سونے کی تلقین کرتے ہوئے اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

ابھی وہ سونے کی تیاری کر ہی رہا تھا کہ ماموں رشید اس کی مزاج پرسی کے لیے آ گئے۔ ماموں رشید پڑھے لکھے آدمی تھے۔ ان کا انداز گفتگو نہایت نرم تھا اور تمام بچے انہیں پسند کرتے تھے۔ وہ اسی گاؤں میں رہتے تھے اور اکثر ہمشیرہ کے احول دریافت کرنے آجایا کرتے تھے۔ ماموں کو مطالعہ اور اصلاح معاشرہ کا شوق تھا اور ان کی گفتگو بھی پر اثر ہوتی تھی۔

ماموں جان اکرام کی چارپائی کے پاس کرسی پر بیٹھ گئے اور حادثے کی مختصر مگر جامع روداد سننے کے بعد احتیاط کی تلقین کی اور کہنے لگے۔

اکرام، آپ کو چوٹ کیوں لگی؟

کارخانے میں اور بھی لوگ تھے، مزدور تھے، کاری گر تھے، اور یوں بھی آپ کا کام تو ہوتا ہی دفتر میں ہے، آپ دفتر سے اٹھے، سٹور میں گئے، چیزوں کو بلاوجہ چھیڑا، بالا گرا اور آپ کے بازو کو زخمی کر گیا۔۔۔۔

آپ نے غور کیا سارے معاملے پر؟

اکرام نے خجالت آمیز لہجے میں کہا، ماموں غور کیا کرنا تھا بس چوٹ لگنی تھی لگ گئی۔

ماموں کہنے لگے، بیٹا ہمیں ہر معاملے میں غور کرنا چاہیے، ہر معلول کی علت تلاش کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ہر اچھے اور برے نتیجے کے پیچھے کوئی نہ کوئی وجہ ہوتی ہے۔ اور پھر وجوہات کی بہت سی اقسام ہوتی ہیں۔ وجوہات مادی بھی ہو سکتی ہیں روحانی بھی، زود اثر بھی ہو سکتی ہے دیر اثر بھی۔ میرا مطلب ہے کچھ علتوں کے نتائج فوری رونما ہوتے ہیں کچھ کے اثرات رونما ہونے میں برسوں لگ جاتے ہیں۔

دیکھو، سبب اور نتیجے کے درمیان ایک رشتہ ہوتا ہے اور اس رشتے اور تعلق کے لیے زمان اور مکان کی قید بھی نہیں ہوتی۔ اگر کوئی عمل یہاں ظہور پذیر ہو تو اس کا نتیجہ ہزاروں میل دور رونما ہو سکتا ہے۔ اسی طرح یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک عمل آج سے ہزاروں برس پہلے واقع ہوا ہو اور اس کا نتیجہ آج سے ہزاروں سال بعد میں ظاہر ہو۔ دیکھو بیٹا، ہمیں ہر واقعہ کے اسباب پر غور کرنا چاہیے، کوئی پریشانی لاحق ہو یا کوئی مصیبت اچانک آن پڑے تو ہمیں اپنے اندر جھانکنا چاہیے شاید کوئی سرا ہاتھ آ جائے۔ یا اپنا کوئی عمل یاد آ جائے جس کا یہ ردِعمل ہو سکتا ہو۔

تو ماموں جان، یہ چوٹ بھی کسی غیر مادی وجہ کا نتیجہ ہو سکتی ہے؟

اکرام نے لطیف انداز پر احترامانہ سنجیدگی کا لبادہ اوڑھ کر پوچھا۔

ہاں ہو سکتا ہے۔ بل کہ آپ کی والدہ کی چھپی ناراضی اس کا سبب ہو سکتی ہے۔

چھپی ناراضی؟

کیا مطلب؟

اکرام نے چونک کر پوچھا۔

مطلب یہ کہ آپ کی والدہ آپ سے ناراض ہیں۔ آج کل آپ کا رویہ کچھ نامناسب ہے۔ آپ کی شادی کے معاملے میں گھر میں سرد جنگ کا سا ماحول ہے۔ جو لوگ اس سلسلے میں آتے ہیں ان کے ساتھ آپ کا رویہ مناسب نہیں ہوتا اور والدہ کے ساتھ آپ کا درشتی آمیز لہجہ۔۔۔۔

اکرام ہلکا سا مسکرا کر کہنے لگا، تو ماموں جان آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ امی نے مجھے بددعا دی ہے!

نہیں بیٹا، ماں بددعا نہیں دیتی، لیکن اس کے دل کو جو تکلیف ہوتی ہے اور دکھ ہوتا ہے وہ اپنا اثر دکھاتے ہیں، یہ ایک تنبیہ ہوتی ہے۔ جس طرح سوئے ہوئے کو جگانے کے لیے جھنجھوڑنا پڑتا ہے اسی طرح یہ بھی ایک جھنجھوڑ ہی سمجھ لیں۔ آپ اپنے رویے میں تبدیلی پیدا کریں، اور گھر کے معاملات کو افہام و تفہیم کے ذریعے حل کرنے کی کوشش کریں۔

اکرام مودبانہ انداز میں سر ہلا کر ماموں کو یقین دلاتا رہا کہ ان کی گفتگو پر تاثیر ہے۔

اگلی صبح تمام معمولات حسب سابق تھے سوائے اس کے کہ ابا جی نے ڈیرے پر جانے سے پہلے بچوں کو فجر کی اذان کے بعد سوئے رہنے کی وجہ سے رزق کی کمی کی وعید سنانے کی بجائے اکرام کا حال پوچھا اور آرام کی تلقین کی۔ ان کے جانے کے بعد ثانیا رات کی بچی ہوئی یخنی گرم کر کے لائی، چارپائی کے قریب تپائی گھسیٹ کر اس پر پیالہ رکھا اور پاس

ہی کھڑی ہوگئی۔اکرام سیدھا لیٹا ہوا تھا لیکن اس نے چہرہ دروازے سے دوسری جانب دیوار کی طرف کیا ہوا تھا۔

ہڈی کیوں نہیں ٹوٹی پھر؟

ثانیا نے دبے دبے غصے سے کہا۔

کوشش تو کی تھی،تم فکر نہ کرو،اس بار نہیں ٹوٹی اب کے بار ٹوٹے گی۔توڑ کے دکھاؤں گا اس بازو کو۔اکرام نے چہرہ موڑے بغیر کہا۔

جو سزا اس بازو کے لیے طے کردی ہے وہ اسے مل کر رہے گی۔اس نے جو گناہ کیا ہے اس کے لئے یہ سزا تو بہت کم ہے۔ اکرام کے لہجے سے دکھ آمیز طنز چھلک رہا تھا۔

ثانیا کچھ دیر خاموش کھڑی رہی پھر آہستگی سے جانے کے لیے مڑی اور دروازے کے پاس رک کر کہنے لگی،آپ کریں اپنی ضد پوری،لیکن یاد رکھیں کہ اب اگر اس بازو کو کچھ ہوا تو۔۔۔۔۔۔

وہ اپنی بات پوری کئے بغیر تیزی سے باہر نکل گئی۔ثانیا کے جانے کے بعد اکرام اٹھ کر یخنی پینے لگا۔

چاشت کے وقت انعام نے بتایا کہ ماسٹر صدیق صاحب بھائی کا پتا لینے آئے ہیں۔

ماسٹر صاحب پڑوس ہی میں رہتے تھے،ساٹھ سال کی عمر میں ریٹائر ہونے کے بعد پچھلے سات سال سے پر سکون زندگی گذار رہے تھے۔ان کو اللہ نے پانچ بیٹوں سے نوازا تھا لیکن بیٹی کی رحمت سے محروم رکھا۔بیٹے شادی شدہ اور برسر روزگار تھے اور الگ الگ مکان میں رہتے تھے جب کہ ماسٹر صاحب اپنے آبائی مکان ہی میں مقیم تھے۔ماہانہ پنشن آجاتی تھی اور بیٹے بھی وقتاً فوقتاً خدمت کرتے رہتے تھے۔ماسٹر صاحب کو مذہب سے لگاؤ تھا اور عبادات ومعاملات کا خاص خیال رکھتے تھے۔سماجی کارکن بھی تھے اس طرح صدقہ وخیرات کرتے رہتے تھے اور فلاحی کاموں میں بھی بڑھ چڑھ کے حصہ لیتے تھے۔

ماسٹر صاحب اکرام کے پاس بیٹھ گئے مزاج پرسی کے بعد نسل نو کی مذہب سے دوری سے متعلق گفتگو کرنے لگے۔گڈی نے سلام کر کے چائے پانی کا پوچھا تو انہوں نے نرم اور معذرت خواہانہ لہجے میں بتایا کہ وہ روزے سے ہیں۔باتوں باتوں میں نماز کا ذکر آگیا تو ماسٹر صاحب نے اکرام سے نماز کی ادائیگی سے متعلق پوچھا۔اکرام نے بتایا کہ کبھی کبھی پڑھ لیتا ہوں لیکن زیادہ تر سستی ہی ہوجاتی ہے۔

اس جواب پر ماسٹر صاحب نے محبت آمیز برہمی سے کہا،بیٹا اس معاملے میں سستی نہیں ہونی چاہیے۔نماز ایک قرض

ہے جو ہم نے ہر حال میں ادا کرنا ہے۔ اس سے کسی صورت چھٹکارا نہیں ہے۔ مذہب انسان کے لیے پناہ گاہ ہے، ایک سایہ ہے۔ انسان زندگی کی دوڑ دھوپ سے تھک جاتا ہے تو مذہب کی گود اسے سکون بخشتی ہے۔ اسے چھاؤں مہیا کرتی ہے۔ جب انسان کے تمام مادی سہارے ختم ہو جاتے ہیں تو مذہب سہارا بنتا ہے۔ یہ دنیا مایوسیوں، تکلیفوں، ناکامیوں اور مسائل سے اٹی پڑی ہے۔ جب ہم اللہ کے حضور سجدہ ریز ہوتے ہیں تو ہماری مایوسیاں آسوں میں بدل جاتی ہیں، تکالیف تسکین بخش ہو جاتی ہیں اور مسائل ہی میں سے وسائل بھی نکل آتے ہیں۔ لیکن جب انسان مذہب سے دوری اختیار کر لیتا ہے تو سب کچھ الٹ جاتا ہے۔ لذات خوشی کی بجائے اکتاہٹ پیدا کرتی ہیں، وسائل کے اندر سے ہی مسائل پھوٹ پڑتے ہیں اور یاد رکھو کہ اگر انسان وقتی طور پر اللہ کو بھول بھی جائے تو اللہ اسے نہیں بھولتا۔ وہ انسان کو مختلف طریقوں سے یاد دلاتا رہتا ہے کہ وہ اس کی رگوں سے بھی زیادہ قریب ہے، وہ اس کے اندر سمایا ہوا ہے۔ اب یہی واقعہ لے لو، اللہ نے آپ کو یاد دلایا ہے کہ اے میرے بندے، غفلت مت کرو۔

اکرام بیٹے، انسان جب مذہب سے دور ہٹ جاتا ہے تو اسے وقتاً فوقتاً جھنجھوڑا جاتا ہے، اسے جھٹکا دیا جاتا ہے، اسے تنبیہ کی جاتی ہے کہ غفلت کی نیند سے جاگو۔ اکرام خاموشی اور عقیدت سے ماسٹر صاحب کی باتیں سنتا رہا اور تفہیمی انداز میں سر ہلاتا رہا۔ جاتے ہوئے ماسٹر صاحب نے اکرام سے وعدہ لیا کہ وہ اب اللہ کے آگے جھکے گا اور اس چوٹ کو ایک تنبیہ جانتے ہوئے اس سے سبق سیکھے گا۔

عصر کے وقت شکیل مزاج پرسی کے لیے آیا۔ چھٹی تو اسے شام کو ہوتی تھی لیکن کارخانے کے مالک، مرزا شاہد صاحب، نے دو گھنٹے پہلے چھٹی دے دی اور کہا کہ اکرام کی طرف جائے اور ان کی طرف سے مزاج پرسی کرے۔ انہوں نے پھل وغیرہ کے لیے دو سو روپے بھی بھجوائے تھے اور کہا تھا کہ شہر جا کے کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھائے۔ اس وقت ابا جی بھی گھر پر ہی تھے انہوں نے انعام سے کہا کہ شکیل کو کمرے ہی میں بلا لاؤ۔

شکیل اکرام کا دوست تھا اور ان دونوں کا ایک دوسرے کے گھر بھی آنا جانا تھا۔ وہ ابا جی کی تندمزاجی سے واقف تھا اور اکثر اکرام کے ساتھ وہ بھی ڈانٹ ڈپٹ کا شکار ہو جاتا تھا۔ ابا جی بھی اسے اپنے بیٹوں جیسا ہی سمجھتے تھے اور اسے ڈانٹ کا اتنا ہی حق دار سمجھتے تھے جتنا اکرام اور انعام کو۔

شکیل اکرام کے پاس چارپائی پر ہی بیٹھ گیا کیوں کہ کمرے میں ایک ہی کرسی تھی جس پر ابا جی بیٹھے ہوئے تھے۔ ابا جی نے شکیل سے گھر اور کارخانے سے متعلق خیر و عافیت دریافت کی اور جب بات اکرام کی چوٹ کی طرف آئی تو کہنے

لگے۔

اگر لاپروائی اور بے دھیانی سے کام کرو گے تو اسی طرح نقصانات اٹھاؤ گے۔ کسی کام میں سنجیدگی اور ضبط نہیں ہے، کوئی معمول نہیں ہے زندگی میں، شوخ پن میں فخر محسوس کرتے ہو، ایک جیسے بد دماغ ہو سارے۔ اب تم بڑے ہو گئے ہو بڑوں والی حرکتیں کیا کرو۔ اکرام خاموشی سے اور شکیل ہوں ہاں اور جی جناب کرتے ہوئے پھٹکار سنتا رہا۔ ابا جی نے شکیل کو دو ماہ پہلے والا واقعہ بھی یاد دلایا جب وہ ہاتھ چھوڑ کر سائیکل چلاتے ہوئے گرا تھا اور گھٹنا زخمی کروا بیٹھا تھا۔ ابا جی نے ڈانٹ میں شفقت کا عنصر شامل کرتے ہوئے کہا۔ اس طرح کی چوٹیں اور تکلیفیں انسان کے لیے سبق آموز ہوتی ہیں۔ انسان ان سے سیکھتا ہے۔ جب انسان بہت لاپرواہ ہو جاتا ہے تو فطرت اسے جھٹکا دیتی ہے، اسے تنبیہ کرتی ہے کہ توجہ اور ضبط کی اہمیت ہے زندگی میں۔

تھوڑی دیر ادھر ادھر کی باتوں کے بعد شکیل نے کہا اکرام کل سے چارپائی پہ پڑا ہے، اس کی تو کمر اکڑ گئی ہو گی، بہتر ہے کہ ہم ذرا چہل قدمی کر آئیں، ٹانگیں بھی سیدھی ہو جائیں گی اس کی۔ اس تجویز کی ابا جی نے بھی تائید کی اور اکرام نے بھی۔

جب وہ آبادی سے باہر نکل آئے تو شکیل نے کہا۔ دو تین دن سے ہماری تفصیلی ملاقات نہیں ہو سکی، کارخانے میں بھی کام زیادہ ہے اور گھر میں بھی عجیب سی مصروفیات رہی ہیں، یہی دیکھ لو کہ تمہارے احوال پوچھنے کے لیے بھی نہ آ سکا، آج بھی مشکل سے ہی آنا ہوتا اگر مرزا صاحب نہ بھیجتے تو۔ چلو اب تفصیل سے بتاؤ کہ چوٹ کیسے لگوائی؟

اکرام کھسیانی سی ہنسی کے ساتھ کہنے لگا۔ یار آپ کو پتا ہے نہ ثانیا سے ہلکی پھلکی نوک جھوک چل رہی ہے، آپ کو بتایا تھا۔ وہ بہت محتاط لڑکی ہے، میں آگے بڑھنے کی کوشش کرتا ہوں تو وہ طرح دے جاتی ہے۔ پرسوں رات وہ مجھے چائے دینے کے لیے آئی تو اس نے آدھی آستینوں والی قمیض پہنی ہوئی تھی، میں اس کی کلائیوں کی تعریف کرتے ہوئے اس کا بازو پکڑ لیا۔ اس بات کا اس نے بہت برا مانا اور کہا یہ گناہ ہے۔ میں بھی جذباتی ہو گیا اور کہنے لگ کہ اگر یہ گناہ ہے تو میرے گناہ گار ہاتھ کو سزا ملنی چاہیے۔ میں نے ثانیا سے کہا کہ اب میں اس ہاتھ کو سزا دوں گا، اس کو توڑ دوں گا۔

کل میں دفتر سے نکل کر بازار گیا، میڈیکل سٹور سے پٹی خریدی، اسے بازو پر لپیٹا اور دفتر آ گیا۔ میں نے سوچا یہ ثانیا کو ایک طرح کی تنبیہ ہو گی۔ ویسے یار آج ثانیا نے خاص طور پر آدھی آستینوں والا سوٹ پہنا ہوا ہے۔

واپسی کے دوران شکیل اور اکرام خاموش ہی رہے۔

ادراک

میں نے زندگی کا چکر پورا کرلیا ہے۔ میں جہاں سے چلا تھا وہیں آن پہنچا ہوں۔ مجھے اب یوں لگ رہا ہے جیسے میں دائروی راستے پر سفر کررہا تھا جس کے مرکز میں کوئی قوت کشش کررہی تھی۔ جس گھر میں اس وقت میں بیٹھا ہوا ہوں وہ گھر بچپن سے میرے ذہن سے چپکا ہوا ہے۔ اس گھر کا یہ منظر ہی وہ قوت تھی شاید جس نے مجھے اس دائرے میں حرکت پر مجبور رکھا۔

میں وسیع گھر میں بیٹھا ہوا ہوں۔ وسیع اس لحاظ سے کہ میرا سارا کنبہ میرے ساتھ ہے۔ ہمارے کنبے میں اتنے افراد ہیں کہ شاید میں گنتی نہ کرسکوں۔ بہت سے چلے بھی گئے، بہت سے جانے والے ہیں، کئی ایک ایسے ہیں جنھوں نے حال ہی میں آنکھ کھولی ہے۔ بعض افراد میرے ساتھ نہیں رہتے، شاید انہیں میرے ساتھ رہنا پسند نہیں یا میرے نظریات اور خیالات پسند نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ بعض کو میں ہی پسند نہ کرتا ہوں۔ تاہم جو میرے ساتھ رہتے ہیں وہ سارے کے سارے اسی ایک جگہ پر موجود ہیں۔ باہر شدید سردی ہے۔ زمین برف سے ڈھک چکی ہے۔ لیکن بادلوں کے دل کی بھڑاس ابھی نہیں نکلی۔ وہ خشک آنسو بکھیرے جارہے ہیں اور زمیں کو سفید چادر میں لپیٹے جارہے ہیں۔ شاید وہ زمین کے پیٹ کی آگ بجھانے کی کوشش کررہے ہوں۔ لیکن چہرہ دھونے سے دل کی آگ نہیں بجھتی۔

باہر جانے کی سکت کسی کے پاس نہیں۔ باہر جانے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ برف نے سب کچھ تو دفنا دیا ہے۔ کوئی ذی روح کہیں بھی نظر نہیں آتا۔ باہر کھانے کو کچھ نہیں بچا۔ باہر نکلنا بے سود ہے۔

ہم سب دیواروں سے لگے بیٹھے ہیں۔ درمیان میں جگہ خالی ہے۔ سب ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہیں۔ رات گہری

ہونے باوجود، نیند شدید ہونے کے باوجود کوئی بھی نہیں سو پارہا، کوئی بھی سونا نہیں چاہتا، کوئی بھی سو نہیں سکتا۔ سب ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہیں، سب ایک دوسرے کو تاک رہے ہیں۔

یہ منظر تقریباً پچیس سال پرانا ہے۔ میں الٹا سفر کر کے وہیں پہنچ رہا ہوں۔ وہ بھی اسی طرح کا گھر تھا، زمان و مکان کا فرق ہوگا، یقیناً ہوگا لیکن مجھے محسوس نہیں ہورہا۔ میں چھوٹا سا تھا، حواس خمسہ جاگ چکے تھے لیکن بصیرت کی آنکھیں ابھی پوری طرح نہیں کھلی تھیں۔ پیش آنے والے واقعات کو دیکھ تو سکتا تھا مگر ان کے اسباب و واقعات کا ادراک نہیں کر سکتا تھا۔ ہم سب دیواروں سے لگے بیٹھے تھے۔ کچھ بچے تھے، بہت سے جوان، چند ایک بوڑھے اور ایک بہت بوڑھا۔

وہ جسیم بوڑھا ہمارا سردار تھا جو کہ بوڑھا ہونے کے باوجود صحت مند، تن درست اور توانا تھا۔ وہ ایک بلند مقام پر بیٹھا ہوا تھا جب کہ باقی افراد، میرے سمیت، اس کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ سب جاگ رہے تھے، گہری رات کے باوجود سب جاگ رہے تھے۔ شدید نیند کے باوجود کوئی بھی نہیں سو رہا تھا، نہ ہی کوئی سونا چاہتا تھا۔ باہر کوئی نہیں جانا چاہتا تھا۔ برف نے زمین اور زمین کے باسیوں کو ڈھک دیا تھا۔ باہر کھانے کو کچھ نہیں تھا۔ ہمارے کنبے کے تمام افراد دیواروں سے لگے بیٹھے تھے۔ سب ایک دوسرے کو تاک رہے تھے، سب ایک دوسرے پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ مکمل خاموشی تھی۔ باہر سے کبھی کبھا جھکڑ چلنے کا اور اندر سے بچوں کے بلکنے کا شور سنائی دے جاتا تھا۔ اس کے علاوہ بس سانسوں کی مدھم مدھم سرسراہٹ تھی۔ بچوں کے بلکنے کی آواز سب کو افسردہ کیے دیتی تھی۔

ہمارا جد امجد، وہ بوڑھا سردار، اس عمر میں بھی چست تھا۔ اسے اپنے اعمال و افعال پر قابو تھا اور اپنے جذبات پر بھی گرفت تھی۔ لیکن اچانک ایک ایسا واقعہ رونما ہوا جس کی کہ توقع ہی نہیں کی جاسکتی تھی۔ بوڑھے سردار کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ یوں محسوس ہونے لگا جیسے نیند نے اس کو گھیر لیا ہو، اس پر غلبہ پالیا ہو، اس سے جیت گئی ہو، اور اس نے نیند کی فوج کے سامنے ہتھیار پھینک دیے ہوں۔ جیسے ہی اس کی آنکھیں بند ہوئیں ہمارے جوانوں کی آنکھیں پوری طرح کھل گئیں۔ سردار کی نیند نے سب کی نیند اڑا دی۔ سب چوکنے ہوگئے، سب کی آنکھیں چمکنے لگیں، مرجھائے ہوئے چہرے کھلنے لگے۔ پھر سب جوانوں نے قریباً ایک ساتھ جست لگائی اور سردار پر پل پڑے۔ سردار نے آنکھیں نہیں کھولیں۔ تھوڑی دیر بعد اس کے جسم کے ٹکڑے ہمارے کنبے کے جوانوں کے منہ میں تھے جو کہ بچوں کی زندگی اور ہمارے قبیلے کی بقا کی ضمانت تھے۔

اپنے حصے کا گوشت کھاتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ سردار کو اچانک نیند کیسے اور کیوں کر آگئی تھی حالاں کہ وہ جوانوں

سے زیادہ چست اور چوکنا تھا؟

چند دن بعد برف باری کی شدت میں کمی آنے لگی اور کبھی کبھار سہ پہر کے بعد سورج بھی چہرہ دکھانے لگا۔ سورج کی اس تاکا جھانکی کے نتیجے میں برف کی چادر میں چھید پڑنے لگے، اس کا تانا بانا کمزور پڑنے لگا اور ان چھیدوں میں سبزہ سر نکالنے لگا۔ ان سبز نرم کانٹوں نے سبزہ خور جانوروں کو کونوں کھدروں سے نکالا اور ہمارے جوانوں کو وقتاً فوقتاً اکا دکا شکار ملنے لگا۔ زندگی پھوٹ پڑی۔ زندگی نے موت کے سفید مقبرے پر زندگی کی سبز چادر چڑھا دی۔

موسم سازگار ہوا تو ہماری ماں ہم تین بہن بھائیوں کو لے کر باہر آ گئی۔ ہمارا باپ ہمارے ساتھ نہیں تھا۔ وہ شدید برف باری کے دنوں میں بے وقت باہر نکل گیا تھا اور پھر واپس نہیں آیا۔ وہ یا تو کسی محفوظ علاقے کی طرف چلا گیا تھا یا پھر کسی شکاری کے شوق کا شکار ہو گیا تھا۔

ہم اپنے گھر سے زیادہ دور نہیں جاتے تھے۔ دن کو کھلی فضا میں چلتے پھرتے اور رات کو واپس گھر آ جایا کرتے تھے۔ موسم اب معتدل رہنے لگا تھا اگرچہ برف کے نشانات میدان جنگ میں معرکے کے بعد کٹی پھٹی لاشوں کی طرح بکھرے پڑے تھے۔

اب ہم اترائی کی طرف بھی چلے جاتے تھے جہاں سیاح برف پر پھسلتے نظر آتے۔ بلندی پر ابھی خوراک کی فراوانی نہیں تھی اور ہماری ماں کافی تجربہ کار تھی اسے معلوم تھا کہ اترائی میں سیاحوں کے خیموں سے کچھ نہ کچھ چرایا جا سکتا ہے۔ چوری کر کے کھانا ہمارے شان کے خلاف تھا۔ ہم مل کر رہتے تھے، مل کر خوراک تلاش کرتے، مل کر شکار کرتے اور مل کر کھاتے تھے۔ لیکن اس وقت ہماری ماں کو اولاد نے کمزور، بزدل اور چور بنا دیا تھا۔ اس نے ہمیں ایک محفوظ مقام پر چھپایا، جس کا تنگ سا دہانہ تھا، اور خوراک کی تلاش میں نکل کھڑی ہوئی۔ تھوڑی دیر بعد واپس آئی تو اس کا چہرہ کامیابی اور شرمندگی کی غمازی کر رہا تھا۔ اس نے ایک خیمے سے پکی ہوئی مرغی چرائی تھی اور سب کی نظروں سے بچتی بچاتی ہمارے پاس آئی تھی۔ ہم تینوں بہن بھائی نرم گوشت کھانے لگے اور ہماری ماں کامیابی سے سرشار مستقبل کے خدشوں سے بھری نظروں سے ہمیں دیکھ رہی تھی۔

اچانک باہر سے لوگوں کے بولنے کی آوازیں آنے لگیں جو بتدریج واضح ہو رہی تھیں۔ کسی نے ماں کو چوری کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا اور قدموں کے نشانات کا پیچھا کرتے ہوئے یہاں آن پہنچے تھے۔ ماں چونکی اور اس نے باہر جھانک کر دیکھا۔ اس کو کچھ نظر آیا یا نہیں لیکن وہ ان کو نظر آ گئی اور وہ ہماری طرف متوجہ ہو گئے۔ وہ ہماری طرف آنے لگے۔

ہماری ماں بہت بہادر اور طاقت ور تھی۔اس کا ڈیل ڈول بھی اچھا تھا،اپنے قبیلے کے قد آور افراد میں اس کا شمار ہوتا تھا۔ اس وقت ماں ڈری ہوئی تھی۔خود تو وہ تین چار دشمنوں سے لڑنے کے لیے اکیلی ہی کافی ہوتی تھی لیکن شاید ہماری وجہ سے کم زور پڑ گئی تھی۔ہم عمر اور تجربے میں چھوٹے تھے اور ماں کو یقین تھا کہ دشمن قبیلے کے لوگ فتح کے نشے میں بچوں کو بھی نہیں چھوڑتے۔اور پھر ہم لوگ ظالم کے لقب سے مشہور تھے،ہمیں خوف اور خون کی علامت سمجھا جاتا تھا اور ظالموں کا قلع قمع کرنا امن وامان کے لیے ضروری ہوتا ہے۔

وہ ہمارے سر پر پہنچ گئے۔ان کے پاس بندوقیں تھیں لیکن وہ ہم سے ڈر رہے تھے۔ہمارا قبیلہ خون خواری میں مشہور تھا اور وہ مسلح ہونے کے باوجود ہمارے قریب ہونے سے خوف زدہ تھے۔آخر کار ایک دوسرے کی ہمت بدھاتے وہ ہماری پناہ گاہ کے دہانے تک پہنچ گئے۔

اب ہماری ماں کے پاس دو صورتیں تھیں۔

وہ باہر نکلتی اور ان امن پسندوں سے مقابلہ کرتی۔اس صورت میں اس کی فتح بھی ہوسکتی تھی اور شکست بھی۔فتح کی صورت میں ہماری جان بچ جاتی،شکست کی صورت میں ہم سب مارے جاتے۔

دوسری صورت یہ تھی کہ ہم وہیں دبکے رہتے۔اس صورت میں ماں کو تو مرنا ہی تھا کیوں کہ وہ دشمن قبیلے سے تعلق رکھنے ساتھ ساتھ چور بھی تھی،لیکن ہمیں کم سنی کی بنیاد پر بخشا بھی جاسکتا تھا۔

ہماری ماں نے دوسری صورت اختیار کی اور ہماری جان بچانے کی کوشش کی۔وہ ہمیں اپنے پیچھے چھپا کر وہیں دبکی رہی۔ایک بندوق نے آگ اور آہن اگلے،پھر دوسری نے،پھر پتا نہیں کتنی بندوقیں گرجیں اور آخر کار خاموشی چھا گئی اور خاموشی کے بعد فتح کے نعرے اور خوشی سے سرشار آوازیں آنے لگیں۔ماں اور میرے دونوں بہن بھائیوں کا جسم چھلنی ہو چکا تھا۔میں اتفاقاً ایک بھی گولی کا شکار نہ ہوسکا۔شاید موت گولی میں نہیں تھی۔

جب ان لوگوں کو یقین ہوگیا کہ ظالم مر چکے ہیں تو بندوقوں کے بعد ان کا منہ بھی بند ہوا۔انہوں نے ماں کو دہانے سے باہر کھینچ لیا۔اس کے جسم سے ابھی تک خون رس رہا تھا۔میں اپنے بہن بھائیوں کے کٹے پھٹے خون آلود جسم کے پاس دبکا،سانس روکے پڑا رہا۔خون میں لت پت بے حس وحرکت پڑے ہونے کی وجہ سے انہیں معلوم نہ ہوسکا کہ ایک ظالم زادہ ابھی زندہ ہے۔انہوں نے ماں کے گلے میں رسی ڈالی اور گھسیٹتے ہوئے اپنے خیموں کی طرف جانے لگے۔ جب ان کی آوازیں سماعت کی پہنچ سے اور ان کے سائے بصارت کی پہنچ سے دور ہوئے تو میں نے کروٹ لی۔میں

خون میں نہایا ہوا تھا۔ میرا سفید جسم سرخ ہو چکا تھا۔ میری آنکھوں میں ماں اور بہن بھائیوں کا خون چبھ رہا تھا۔ میری زبان پر ان کے خون کا نمکین ذائقہ تھا۔ میں نے اپنے بہن بھائیوں کے جسم کو سونگھا، چاٹا اور ان پر پاؤں رکھ کر باہر نکل آیا۔

جب میں اپنے کنبے کے ساتھ یہاں چھپا ہوا تھا تو میں کم عمر، نا تجربہ کار، کم زور، بہن بھائیوں سے کھیلنے والا بچہ تھا۔ جب میں ماں اور بہن بھائیوں کے خون کا ذائقہ چکھ کر باہر نکلا تو میں وہ کچھ اور تھا۔ اب میں خون میں نہلایا ہوا، خون کے ذائقے سے شناسا، خون کی بو سے واقف، خون خوار درندہ بن چکا تھا۔ وہ منظر جو میں نے دیکھا تھا میرے ذہن سے چپک گیا، اور ابھی تک چپکا ہوا ہے۔ میں نے یہ حادثہ اپنے لاشعور میں چھپا لیا۔ وہ حادثہ میں نے ابھی تک اپنے لاشعور میں دبایا ہوا ہے۔ اور یہی واقعہ میری زندگی کی تمام جدوجہد کا محرک بنا۔

اس وقت میری زندگی کی کتاب کے اوراق میرے سامنے پلٹتے جا رہے ہیں۔ میری زندگی کے واقعات میرے سامنے سے گذر رہے ہیں۔

میں نے اکیلے زندگی کا سفر شروع کیا۔ اور پھر ایک قبیلے میں شامل ہو کر اس کا رکن بن گیا۔ جب میں جز سے کل میں آیا تو طاقت کی علامت بن گیا۔ خون خواری، ڈاکہ، راہ زنی، قتل، ہر ظلم جو میری جبلت میں شامل تھا میں نے روا رکھا۔ اسی بے باکی اور بے رحمی کی بنا پر آخر کار میں اسی گروہ کا سردار چن لیا گیا۔

میں نے اپنے عہدے کا حق ادا کر دیا۔ اپنی جسامت، بہادری، بے باکی اور خون خواری کو اپنے قبیلے کی فلاح کے لیے استعمال کیا۔ اپنی تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اپنے قبیلے کو طاقت بخشی۔ اپنے قبیلے کے ساتھ اس علاقے میں برسوں راج کیا۔

ہمارے گروہ میں بہت سے افراد آئے اور گئے۔ بہت سے دشمنوں کو ہم نے مارا۔ ہمارے بہت سے افراد مارے گئے۔ اسی قتل و غارت اور تلاش رزق میں زندگی گذرتی گئی۔

اس سال سردی زیادہ ہے۔ یا پھر مجھے لگ رہا ہے کہ سردی پہلے کی نسبت زیادہ ہو گئی ہے۔ شاید میں کم زور ہونے لگا ہوں یا ہو گیا ہوں۔ میری جسمانی سکت کم پڑ گئی ہے، برداشت کم ہو گئی ہے، سردی برداشت کرنے کا ملکہ کم ہو گیا ہے، جو بھی وجہ ہے سردی بحر حال اس دفعہ زیادہ ہے۔

ہم سردی سے چپ کر بیٹھے ہوئے ہیں۔ سب دیواروں سے لگے بیٹھے ہیں۔ درمیاں سے جگہ خالی ہے۔ سب ایک

دوسرے کو دیکھ رہے ہیں۔رات گہری ہونے کے باوجود، نیند شدید ہونے کے باوجود کوئی بھی سو نہیں پا رہا۔کوئی بھی سونا نہیں چاہتا۔کوئی بھی سو نہیں سکتا۔سب ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہیں۔سب ایک دوسرے کو تاک رہے ہیں۔ہم سب دائرے میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ کچھ بچے ہیں، کچھ جوان ہیں، چند ایک بوڑھے اور میں سب سے بوڑھا۔ میں ان کا سردار ہوں۔ بوڑھا ہونے کے باوجود صحت منداور جسیم۔ میں ایک بلند مقام پر بیٹھا ہوں۔ باقی تمام افراد میرے سامنے بیٹھے ہیں۔رات گہری ہونے کے باوجود سب جاگ رہے ہیں۔شدید نیند کے باوجود کوئی بھی سونا نہیں چاہتا۔ باہر کوئی نہیں جا سکتا۔باہر شدید برف باری نے زمین اور زمین کے تمام باسیوں کو ڈھکا ہوا ہے۔باہر کھانے کو کچھ نہیں۔ ہمارے گروہ کے تمام افراد دیواروں سے لگے بیٹھے ہیں۔ایک دوسرے کو تاک رہے ہیں۔ایک دوسرے پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔مکمل خاموشی ہے۔باہر سے کبھی کبھی جھکڑ چلنے کی اندر سے بچوں کے بلکنے کی آوازیں سنائی دے جاتی ہیں۔ بچے بھوک سے بلک رہے ہیں۔انہیں کھانے کو کچھ نہ ملا تو وہ مر سکتے ہیں۔اگر وہ مرے تو ہماری نسل آگے نہیں بڑھے گی۔لیکن ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ایسا نہیں ہوگا۔ ہماری نسل آگے بڑھے گی۔ میں اپنی نسل کی صورت میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ میں سردار ہوں سب کی نظریں میری طرف ہیں۔سب مجھے حسرت اور التجا بھری نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ خاموش نگاہیں چیخ رہی ہیں۔ میں سردار ہوں۔ مجھے ہی کچھ کرنا ہے۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ میں نے بچوں کو زندہ رکھنا ہے۔میں اپنی آنکھیں بند کر رہا ہوں، اگر چہ میں صحت منداور توانا ہوں، نیند مجھ پر غلبہ نہیں پا سکتی لیکن میں آنکھیں بند کر رہا ہوں۔

اب مجھے ادراک ہوا کہ ہمارا سردار چست اور توانا ہونے کے باوجود سو کیوں گیا تھا۔

واپسی

رات کا سناٹا شہر کی دھڑکنوں میں گھل چکا تھا۔ چاندنی سمندر کی سطح پر بکھری ہوئی ایسی لگتی تھی جیسے کسی ٹوٹے ہوئے آئینے کے ٹکڑے پانی میں جھلملا رہے ہوں۔ کامران ساحل پر عمودی چٹان کے کنارے کے قریب بیٹھا، گزری ہوئی زندگی کے زخم گن رہا تھا۔

اس کی زندگی ایک مسلسل جنگ تھی، جس میں ہر دن ایک نئی آزمائش لے کر آتا۔ بچپن غربت میں گزرا، تعلیم کے خواب وسائل کی زنجیروں میں جکڑے رہے۔ جوانی میں محنت کی چکی میں پستا رہا، مگر کامیابی ہمیشہ ایک سراب کی مانند دور رہی۔ والدین کا بوجھ، بہنوں کی ذمہ داری، معاشرے کے طعنے، سب کچھ اس پر چٹان کی مانند ٹوٹ رہے تھے۔

دنیا کے اس میلے میں وہ فقط تماشائی تھا۔ لوگوں نے اسے دھتکارا، وقت نے اسے روند ڈالا۔ جہاں وہ نوکری کے لیے گیا، وہاں سفارش کی دیوار کھڑی تھی، جہاں عزت کی تلاش میں گیا، وہاں استحصال کا جال بچھا تھا۔ دن بھر ذلت اٹھانے کے بعد جب وہ رات کو بستر پر لیٹتا تو اس کے کانوں میں وہی جملے گونجتے جو اسے کمتر ثابت کرنے کے لیے کہے گئے تھے۔

آخر کار، جب حوصلے کے تمام چراغ بجھ گئے اور امید کی آخری کونپل بھی سوکھ گئی، تو کامران نے فیصلہ کر لیا کہ اب مزید اس بے رحم دنیا کا حصہ بننا بیکار ہے۔ زندگی اگر زندان ہے تو اس سے فرار ہی نجات ہے۔

وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھا رہا تھا، قدموں میں عجب بوجھل پن تھا، مگر دل کسی بوجھ سے آزاد محسوس ہو رہا تھا۔ ساحل کے اس کنارے ایک بلند چٹان تھی، جہاں سے نیچے صرف پانی کی گہرائی تھی۔ وہ چٹان کی جانب بڑھنے لگا، ہر قدم

اسے ایک انجانی آزادی کی طرف لے جا رہا تھا۔

چٹان کے کنارے پہنچ کر اس نے نیچے جھانکا۔ پانی بے چینی سے اچھل رہا تھا، جیسے کسی بھٹکے ہوئے مسافر کو اپنی آغوش میں لینے کے لیے بیقرار ہو۔ اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں، سانسیں بے ترتیب ہو گئیں۔ مگر عین اسی لمحے، ہوا میں ایک سرسراہٹ گونجی۔

" کامران! ٹھہرو"!

اچانک، جیسے زمین کے اندر سے کوئی آہ بھرتا ہوا ابھرا ہو، قریب ہی ایک خشک درخت کے تنے سے دھواں اٹھا اور انسانی شکل میں ڈھلنے لگا۔ دھند چھٹتے ہی ایک پراسرار وجود نمایاں ہوا—ایک طویل قامت، مضبوط جسامت والا شخص، جس کی داڑھی برف کی مانند سفید تھی، اور چہرے پر عجب وقار اور طمانیت چھائی ہوئی تھی۔ اس نے ایک سادہ چغہ پہنا ہوا تھا، اور اس کی آنکھوں میں فلسفیانہ گہرائی تھی۔

کامران نے چونک کر اس بھوت کو دیکھا۔ وہ سراپا حیرت بنا، مگر خوف نے اس کی زبان سلب کر لی۔

وہ پراسرار وجود ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ گویا ہوا،

"میں حکیم ہوں، وہ شخص، جسے دنیا حکمت و دانائی کے تاج سے نوازتی ہے، مگر جسے اسی دنیا نے زہر کا پیالہ پینے پر مجبور کیا۔"

کامران نے لرزتی آواز میں پوچھا، "تم... تم نے خودکشی کی؟"

حکیم نے ایک ہلکی سی ہنسی کے ساتھ جواب دیا، "نہیں، میرے دوست! میری موت میری اپنی پسند نہیں تھی، مگر میں نے اسے خوش دلی سے قبول کیا۔ یہ لوگ مجھے سچ بولنے کی سزا دے رہے تھے، مگر میں نے زندگی کے مقابلے میں سچ کو چنا۔ اور جب زہر کا پیالہ میرے لبوں سے لگا، تو میں نے اسے یوں پیا جیسے پیاسا پانی پیتا ہے۔"

کامران نے حیرانی سے پوچھا، "پھر تم یہاں کیوں آئے ہو؟"

حکیم کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ وہ چٹان پر بیٹھ گیا اور نگاہیں سمندر کی وسعتوں میں دوڑاتے ہوئے بولا،

"میں تمہیں بتانے آیا ہوں کہ زندگی کے مسائل سے فرار بزدلی ہے۔ تم شاید سوچ رہے ہو کہ موت تمہیں سکون دے گی، مگر یہ ایک سراب ہے۔ میں نے زندگی کے ہر پل کو حق و حکمت کی نظر سے دیکھا، اور جب میرے لیے زندگی کے دروازے بند کر دیے گئے، تب بھی میں نے اس حقیقت کو قبول کیا، مگر فرار نہیں چاہا۔"

حکیم نے کامران کی آنکھوں میں جھانکا، جیسے اس کی روح تک اتر جانا چاہتا ہو۔" مگر تم تو خود ہی اپنی زندگی کا دروازہ بند کرنا چاہتے ہو؟ کیا تمہیں واقعی لگتا ہے کہ یہ تمہارے درد کا حل ہے؟"

کامران الجھن میں پڑ گیا۔ اس کے لب خاموش تھے، مگر ذہن میں خیالات کا ہجوم تھا۔

کامران نے ابھی حکیم کے الفاظ پر غور کرنا شروع ہی کیا تھا کہ اچانک ہوا میں ایک عجیب سی مہک پھیلنے لگی—— گلاب اور صندل کی خوشبو، جس میں کسی غیر مرئی زہر کی آمیزش تھی۔ سمندر کی ایک سبک لہر چٹان سے ٹکرائی، اور پانی کے قطروں میں ایک دھندلی شبیہ ابھرنے لگی۔ چند لمحوں میں وہ دھند ایک مجسم شکل اختیار کر گئی۔

یہ ایک غیر معمولی عورت تھی—— دراز قد، نازک مگر پُر وقار، ریشمی لباس میں ملبوس، جس کے سنہری کنارے چاندنی میں جھلملاتے تھے۔ اس کی بڑی اور گہری آنکھوں میں عجب سحر تھا، اور سر پر شاہی تاج دمک رہا تھا۔ ہاتھ میں ایک چمکتا ہوا سونے کا پیالہ تھا، جس کے کنارے پر ایک چھوٹا سا سانپ لپٹا ہوا تھا۔

"میں ملکہ ہوں"... اس کی آواز میں ایک مخمور کشش تھی، جیسے کسی قدیم مصر کی روح بول رہی ہو۔

کامران بے ساختہ پیچھے ہٹ گیا، "تم بھی... مر چکی ہو؟"

ملکہ ہلکے سے مسکرائی، مگر اس مسکراہٹ میں ایک گہرا دکھ چھپا تھا۔ "ہاں، میں نے اپنی زندگی کا اختتام خود چُنا تھا۔ جب رومیوں نے میرے ملک کو روند ڈالا، جب میرے تاج کی آبرو خاک میں مل گئی، جب سب دروازے بند ہو گئے، تو میں نے ایک آزاد ملکہ کی طرح مرنا بہتر سمجھا۔ میں نے زہریلے سانپ کو اپنے جسم پر بٹھا لیا، اور اس کے ایک ہی بوسے نے مجھے اس دنیا کے جھوٹے تماشے سے نجات دے دی۔"

کامران نے گہری سانس لی، " مگر تم... تمہیں افسوس نہیں ہوا؟ زندگی کی روشنی سے خود کو محروم کرنے کا؟"

ملکہ کے چہرے پر ایک گہری سنجیدگی چھا گئی۔ "افسوس؟ نہیں، مجھے افسوس اس وقت ہوتا اگر میں زندہ رہ کر اپنے دشمنوں کے قدموں میں گرتی۔ میں نے موت کو اپنے وقار کی قیمت پر خریدا، اور یہ سودا برا نہ تھا۔"

وہ آگے بڑھی، اس کی آنکھیں کامران کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ "تم بھی تو اسی راہ پر ہو ناں؟ تم بھی وہ سب کچھ کھو چکے ہو جو تمہیں عزیز تھا۔ تو پھر کیوں تردد؟ آؤ، موت کو اپنی بانہوں میں لو، جیسے میں نے لیا تھا۔ دیکھو، کیسا سکون ہے اس میں۔ کوئی دکھ، کوئی تماشا نہیں۔ بس ایک خاموش نجات۔"

اس نے وہ سنہری پیالہ کامران کے سامنے بڑھایا، جیسے موت کا جام اس کے ہونٹوں سے لگانے کا کہہ رہی ہو۔

کامران کے دل میں ہلچل مچ گئی۔ کیا واقعی یہی حل تھا؟ کیا واقعی مر جانے میں سکون تھا؟

ملکہ کے لبوں پر ہنوز ایک زہریلی مسکراہٹ تھی، مگر جیسے ہی وہ سنہری پیالہ کامران کے قریب لے کر آئی، اچانک فضا میں ایک گہری گونج سنائی دی، جیسے تاریخ کی دیواروں پر کوئی دستک دے رہا ہو۔

چٹان کی دوسری سمت سے دھیرے دھیرے ایک سایہ ابھرا۔ یہ کوئی عام سایہ نہ تھا، بلکہ ایک پُرعزم چہرے والا شخص تھا، جس کی آنکھوں میں صدیوں کی تھکن اور عزم کی چمک دونوں جھلک رہے تھے۔ اس کی جلد سیاہ تھی، مگر شخصیت کسی چمکتے ہوئے فولاد کی طرح مضبوط۔ اس نے سادہ مگر نفیس لباس پہن رکھا تھا، اور اس کے ہر قدم میں ضبط و تحمل کی شان تھی۔

"میں افریقی رہنما"... اس نے دھیرے سے کہا، جیسے الفاظ میں ہی کوئی انقلاب پوشیدہ ہو۔

ملکہ نے ناگواری سے رخ موڑا، مگر کامران کی آنکھیں اس نئے بھوت پر جم گئیں۔

"تم نے بھی اذیتیں سہیں؟" کامران نے بے ساختہ پوچھا۔

افریقی ہلکے سے مسکرایا، "اذیتیں؟ میں نے اپنی جوانی کے ستائیس سال جیل کی کال کوٹھری میں گزارے۔ میں نے اپنے ہی وطن میں غلامی کا دور دیکھا، میں نے اپنی قوم کو بکھرتے دیکھا، میں نے اپنے بچوں کو اپنے بغیر جوان ہوتے دیکھا۔ میں نے وہ اندھیرے جھیلے جنہیں تم شاید سوچ بھی نہ سکو۔ مگر میں ٹوٹا نہیں، میں جھکا نہیں۔"

کامران پر ایک لمحے کے لیے سناٹا طاری ہو گیا۔ وہ آنکھیں جھپکائے بغیر اس سیاہ فام انسان کو دیکھ رہا تھا، جو تاریخ کے صفحات میں زندہ رہنے والوں میں سے تھا۔

" مگر تم نے کیسے جھیلا؟ کیسے برداشت کیا وہ سب کچھ؟"

افریقی کی مسکراہٹ میں ایک عزم کی روشنی جاگی۔" کیونکہ میں جانتا تھا کہ یہ سب ایک دن ختم ہو جائے گا۔ ہر رات کے بعد دن طلوع ہوتا ہے، ہر زخم آخر بھر ہی جاتا ہے، ہر جنگ کا کوئی نہ کوئی انجام ہوتا ہے۔ میں اپنی جنگ میں آخری لمحے تک ڈٹا رہا، اور آخر کار میں نے آزادی دیکھی، میں نے اپنی قوم کو سر اٹھاتے دیکھا۔"

ملکہ طنزیہ ہنسی ہنسی، "اور اس دوران تم نے کتنا کچھ کھو دیا، ناں؟ کیا تمہیں افسوس نہیں کہ تم نے وقت کے اندھیرے میں اپنا آدھا وجود دفن کر دیا؟"

افریقی نے گہری سانس لی اور سکون سے کہا، "وقت تمہیں دفن نہیں کرتا، یہ تمہیں تراشتا ہے۔ اگر میں نے خودکشی کر لی ہوتی، تو شاید میرا نام بھی تاریخ کے اندھیرے گوشوں میں کھو جاتا۔ مگر میں نے جبر کے خلاف سینہ تان کر کھڑا ہونا سیکھا،

اور آج میرا نام ظلم کے خلاف ایک چراغ کی مانند روشن ہے۔"

کامران کی آنکھوں میں ایک چمک سی ابھری۔ اس کے دل میں پہلی بار احساس ہوا کہ شاید زندگی کو ایک موقع اور دینا چاہیے۔

مگر اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتا، قریب ہی ایک پرانی، خشک لکڑی کے تنے سے سرسراہٹ ہوئی۔ ہوا میں پھر ایک مہک ابھری—اس بار یہ کسی پھول کی خوشبو نہ تھی، بلکہ کسی پرانی روغنی رنگوں اور مایوسی میں لپٹی ہوئی خوشبو تھی۔

"دیکھو، کوئی اور آ رہا ہے"... افریقی نے آہستہ سے کہا اور ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔

خشک درخت کے کھوکھلے تنے سے ایک مدھم سرسراہٹ سنائی دی، جیسے کوئی دبی آواز میں ماتم کر رہا ہو۔ چاندنی میں ایک دھندلی شبیہ ابھرنے لگی—ایک دبلا پتلا شخص، الجھے ہوئے سرخ بال، زرد چہرہ، اور آنکھوں میں ایک بیقرار چمک۔ اس کے لباس پر روغنی رنگوں کے دھبے تھے، جیسے کسی مصور کا بے ترتیب کینوس۔ ایک ہاتھ میں ایک پرانا برش تھا اور دوسرے میں ایک پھٹا ہوا کینوس۔

"میں مصور ہوں" اس نے دھیرے سے کہا، اور اس کی آواز میں کوئی ان دیکھی اداسی چھپی تھی۔

کامران نے ایک لمحے کو سانس روکی۔ یہ وہی مصور تھا، جس نے اپنے دکھوں کو رنگوں میں سمویا تھا، جو زندگی بھر سکون نہ پا سکا تھا۔

"میں نے خواب دیکھے تھے، مگر وہ سب خواب بکھر گئے۔ میں نے رنگوں میں زندگی کی روشنی تلاش کی، مگر یہ دنیا صرف سیاہی سے بھری ہوئی نکلی۔"

اس نے اپنے کینوس کو تھامے ہوئے کامران کی طرف دیکھا، جیسے کوئی کھوئی ہوئی روح کسی شناسا کو پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔

"میں نے محبت کی، مگر محبت نے مجھے ٹھکرا دیا۔ میں نے دنیا کو خوبصورتی دینے کی کوشش کی، مگر دنیا نے مجھے ایک دیوانہ سمجھا۔ میں نے اپنے دل کو رنگوں میں انڈیل دیا، مگر کوئی نہ سمجھ سکا کہ میری بنائی ہوئی تصاویر میں کتنا درد چھپا ہے۔"

کامران نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا، "پھر تم نے...؟"

مصور ہلکے سے مسکرایا، مگر یہ ایک اداس مسکراہٹ تھی۔ "پھر؟ میں نے اپنی زندگی خود ختم کر دی۔ ایک صبح، میں نے خود پر گولی چلا دی۔ مگر تم جانتے ہو؟ مرنے کے بعد بھی مجھے سکون نہ ملا۔ میری بنائی ہوئی تصاویر، جو میں نے چند سکوں میں

بیچ دی تھیں، مرنے کے بعد لاکھوں میں بکنے لگیں۔ لوگ تب جا کر سمجھے کہ میں کون تھا، مگر تب تک میں قبر کی مٹی میں دفن ہو چکا تھا۔"

اس نے کامران کی آنکھوں میں جھانکا۔ "تم بھی میری طرح ہو، ناں؟ تمہیں بھی دنیا نے مسترد کر دیا، تمہیں بھی اپنے خواب ٹوٹتے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔ تو پھر انتظار کس بات کا؟ چلو، اپنی اذیت سے نجات پا لو۔ یہ دنیا تمہارے جانے کے بعد ہی تمہاری قدر کرے گی۔"

کامران کے ذہن میں ایک لمحے کو اندھیرا چھا گیا۔ کیا واقعی ایسا ہی تھا؟ کیا مرنے کے بعد دنیا پہچانتی تھی؟

مگر اسی لمحے، ایک مضبوط اور گہری آواز فضا میں گونجی۔

"یہ سچ نہیں ہے مصور! ۔ تمہاری کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی"!

چٹان کے کنارے پر ایک اور سایہ ابھرا۔ یہ ایک لمبا، پر وقار شخص تھا، جس کی آنکھوں میں زندگی کا جوش اور پیشانی پر صدیوں کی مشقت کے آثار تھے۔ وہ پرانے مگر نفیس کپڑوں میں ملبوس تھا، اور اس کے ایک ہاتھ میں روشنی کی مانند چمکتا ہوا کوئی چھوٹا سا آلہ تھا۔

"میں موجد ہوں"... اس نے دھیرے سے کہا، مگر اس کے لہجے میں ایک غیر متزلزل عزم تھا۔

"اور میں تمہیں بتانے آیا ہوں کہ شکست صرف اسی کی ہوتی ہے جو خود ہار مان لے۔"

چاندنی میں موجد کا چہرہ روشن ہو گیا، جیسے کوئی چراغ جل اٹھا ہو۔ اس کی آنکھوں میں یقین کی روشنی تھی، اور اس کا انداز کسی ایسے شخص کا تھا جو زندگی کی حقیقتوں کو جان چکا ہو۔

"مصور! تم نے اپنی ناکامیوں کو اپنی قبر بنا لیا، مگر میں نے اپنی ناکامیوں کو اپنے چراغ کی روشنی میں ڈھال لیا"! موجد نے پر جوش آواز میں کہا۔

کامران حیرانی سے دیکھنے لگا۔ یہ وہی موجد تھا، جو لاکھوں تجربات کے باوجود کبھی نہیں تھکا، جو ہر ناکامی کے بعد دوبارہ کھڑا ہوا۔

"تم جانتے ہو، کامران؟ میں نے دس ہزار بار ایک فانوس بنانے کی کوشش کی، اور ہر بار ناکام ہوا۔ لوگ ہنستے تھے، میرا مذاق اڑاتے تھے، کہتے تھے کہ میں دیوانہ ہوں۔ مگر میں نے ہر ناکامی سے سیکھا۔ میں نے اپنے آپ سے کہا کہ میں ناکام نہیں ہوا، میں نے صرف وہ دس ہزار طریقے دریافت کیے ہیں جو کام نہیں کرتے"!

مصور ہلکے سے مسکرایا، مگر اس کی مسکراہٹ میں تلخی تھی۔ "تم خوش نصیب تھے کہ تمہیں اپنی کوششوں میں حوصلہ ملا۔ میں تو جس کے لیے جیتا تھا، وہی مجھے نہ سمجھ پایا۔"

موجد نے سنجیدگی سے کہا، "یہ زندگی دوسروں کی تسکین کے لیے نہیں، بلکہ اپنے خوابوں کی تکمیل کے لیے جینی چاہیے۔ اگر میں اپنی ناکامیوں سے گھبرا کر خودکشی کر لیتا، تو آج دنیا تاریکی میں ہوتی"!

کامران کے دل میں ایک ہلچل مچ گئی۔ شاید واقعی، ناکامی کا مطلب اختتام نہیں ہوتا، بلکہ ایک نیا آغاز ہوتا ہے۔

مگر اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا، چٹان کے کنارے سے ایک اور سایہ ابھرا۔ ایک مرد جس کی پیشانی پر تاج کا سا وقار تھا، مگر آنکھوں میں ایک نہ ختم ہونے والا غم۔ اس کا سرخ اور سیاہ چغہ ہوا میں لہرا رہا تھا، اور اس کے لبوں پر ایک پراسرار مسکراہٹ تھی۔

"شاہ روم"... اس نے دھیمی مگر سرسراتی آواز میں کہا، اور کامران کو یوں محسوس ہوا جیسے تاریخ کا ایک بھیانک لمحہ اس کے سامنے آ گیا ہو۔

کامران کا دل بے اختیار دہل گیا۔ وہ نام سنتے ہی پہچان گیا کہ یہ وہی شاہ روم تھا، روم کا بدنامِ زمانہ بادشاہ، جس نے اپنے ہی شہر کو جلا دیا اور جب پورا شہر شعلوں کی لپیٹ میں تھا، تو وہ اپنی بانسری بجاتا رہا۔

"تمہیں معلوم ہے، کامران؟ میں نے روم کو آگ میں جھونک دیا، مگر مجھے کوئی افسوس نہیں۔ میں ایک فنکار تھا، اور دنیا نے مجھے ایک ظالم کہا! میں نے عظمت چاہی، اور دنیا نے مجھے مسترد کر دیا۔ جب لوگوں نے مجھ سے نفرت کی، جب سلطنت نے مجھے رد کر دیا، تو میں نے اپنی جان خود لے لی، کیونکہ ایک بادشاہ کسی اور کے ہاتھوں مرنے کے لیے پیدا نہیں ہوتا"!

اس نے اپنے سرخ چغے کو جھٹکا دیا، جیسے شعلوں کی لپٹیں بھڑک رہی ہوں۔ "تم بھی میری طرح ہو، کامران! اس دنیا نے تمہیں مسترد کر دیا، لوگوں نے تمہاری قدر نہیں کی۔ تو پھر انتظار کیسا؟ جست لگاؤ، اور اس تکلیف سے نجات پاؤ"!

کامران کی آنکھوں میں ایک لمحے کو تاریکی چھا گئی۔ کیا واقعی یہی حل تھا؟ کیا وہ بھی اس بادشاہ کی طرح اپنی قسمت پر مہر لگا دے؟

مگر اس سے پہلے کہ وہ کوئی فیصلہ کرتا، ایک اور بھاری قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ چٹان کے دوسرے کنارے سے ایک مضبوط، دراز قد شخص نمودار ہوا۔ اس کی آنکھوں میں درد تھا، مگر چہرے پر صبر کی روشنی۔ وہ ایک لمبا سیاہ کوٹ پہنے تھا،

اوراس کے چہرے پر گہری لکیریں تھیں، جو برسوں کی جدوجہد کی گواہی دے رہی تھیں۔

"میں لکڑہارا ہوں"... اس نے دھیرے سے کہا، مگر اس کی آواز میں ایسی گونج تھی جیسے تاریخ خود بول رہی ہو۔

شاہ روم نے استہزائیہ انداز میں ہنکارا، "اوہ، عظیم صدر! مگر مجھے حیرت ہے کہ تم زندہ کیسے بچے؟ تمہاری قسمت بھی تو میرے جیسی ہی تھی"!

لکڑہارے نے ایک لمحے کے لیے شاہ روم کو دیکھا، جیسے کسی گمراہ روح پر ترس کھا رہا ہو، پھر اس کی نظریں کامران پر مرکوز ہو گئیں۔

" کامران، کیا تم جانتے ہو کہ میں کتنی بار ناکام ہوا؟" اس کی آواز میں ایسی گونج تھی جیسے وقت خود بول رہا ہو۔ " مجھے اپنی زندگی میں بار بار شکست ہوئی۔ 1832 میں میں کاروبار میں ناکام ہوا، 1836 میں ذہنی دباؤ کی وجہ سے بستر پر جا گرا، 1856 میں صدارتی انتخاب ہار گیا، اور جب میں آخر کار صدر بنا، تو پورا ملک خانہ جنگی میں الجھا ہوا تھا۔"

شاہ روم نے تمسخرانہ انداز میں کہا، "اور پھر کیا ہوا؟ تمہیں بھی قتل کر دیا گیا، بالکل میری طرح"!

لکڑہارے نے پرسکون مسکراہٹ کے ساتھ کہا، "ہاں، میں قتل ہو گیا، مگر میں شکست خوردہ نہیں تھا۔ میں نے ملک کو ایک رکھا، میں نے غلامی کا خاتمہ کیا، اور میں نے ایک ایسی قوم کو مضبوط کیا جو صدیوں تک قائم رہے گی۔ میرے مرنے کے بعد بھی لوگ میرے اصولوں پر چلتے رہے۔ مگر تم، شاہ روم... تمہاری آگ تمہیں بھی جلا گئی۔"

شاہ روم کا چہرہ ایک لمحے کے لیے سخت ہو گیا، مگر پھر اس کی مسکراہٹ لوٹ آئی۔ "سب کہانیاں ہیں، لکڑہارے! حقیقت تو یہ ہے کہ ہم دونوں مٹی میں جا ملے۔ موت تو ہم سب کی قسمت ہے"!

لکڑہارے نے کامران کی طرف دیکھا۔ "ہاں، موت اٹل ہے، مگر یہ تم پر ہے کہ تم کیسے جیتے ہو۔ مشکلات آتی ہیں، مگر اگر تم صبر اور عزم سے کام لو، تو تمہاری زندگی دوسروں کے لیے روشنی کا مینار بن سکتی ہے۔"

کامران گہری سوچ میں پڑ گیا۔ ایک طرف شاہ روم تھا، جو اپنی بربادی کا جشن منا رہا تھا، اور دوسری طرف لکڑہارا، جو ثابت قدمی کی علامت تھا۔

کامران تذبذب کا شکار ہو چکا تھا لیکن ابھی تک شاہ روم کے جادو میں اسیر تھا۔ اچانک سمندر کی لہروں میں ایک غیر محسوس سی تبدیلی آئی۔ رات کی سیاہی میں ایک نیا سایہ ابھرا، جو روشنی کی مانند تھا۔ ایک نوجوان عورت، جس کی آنکھیں بے نور تھیں، مگر چہرے پر ایسا سکون تھا جیسے اس نے کائنات کی سب حقیقتوں کو سمجھ لیا ہو۔

"میں مصنفہ ہوں"، اس کی آواز میں ایسی لطافت اور مضبوطی تھی کہ ملکہ اور شاہ روم ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گئے۔

کامران نے حیرت سے دیکھا، "تم تو دیکھ بھی نہیں سکتی، سن بھی نہیں سکتی تھیں... پھر بھی تم نے زندگی کیسے گزاری؟"

مصنفہ مسکرائی، "ہاں، میں نہ دیکھ سکتی تھی، نہ سن سکتی تھی، نہ بول سکتی تھی۔ ایک بے بس، خاموش اندھیرے میں قید لڑکی! مگر میں نے اس اندھیرے کو روشنی میں بدلا۔ میں نے نہ صرف تعلیم حاصل کی، بلکہ اپنے جیسے لاکھوں لوگوں کے لیے امید بن گئی۔ میں نے سکھایا کہ اگر ہمت ہو تو روشنی کے بغیر بھی راستے تلاش کیے جا سکتے ہیں"!

ملکہ نے ہنکارا بھرا، " مگر زندگی میں کچھ چیزیں برداشت سے باہر ہوتی ہیں۔ تمہیں علم تھا کہ تم کبھی دیکھ نہیں سکو گی، کبھی سن نہیں سکو گی، پھر بھی تم نے جینے کا فیصلہ کیوں کیا؟"

مصنفہ نے اپنی نابینا آنکھوں سے ملکہ کی طرف دیکھا، جیسے وہ اس کے سوال میں چھپی حقیقت کو جان چکی ہو۔" کیونکہ زندگی جینے کے لیے ہے، ہار ماننے کے لیے نہیں! تم نے زندگی کی مشکلات کو اپنی کمزوری بنایا، مگر میں نے اپنی خامیوں کو اپنی طاقت بنایا۔ میں نے وہ سیکھا جو دیکھنے اور سننے والے لوگ بھی نہیں سیکھ سکے — یہ کہ ہمت اور محنت سے کچھ بھی ممکن ہے"!

شاہ روم نے زہرخند لہجے میں کہا، "اور آخر میں؟ تمہاری زندگی بھی تو ختم ہو گئی، موت سب کو لے جاتی ہے"!

مصنفہ مسکرائی، "ہاں، موت سب کو آتی ہے، مگر اصل سوال یہ ہے کہ تم مرتے کیسے ہو؟ میں مرنے کے بعد بھی لوگوں کے دلوں میں زندہ ہوں۔ میری کہانی لاکھوں اندھوں اور بہروں کے لیے روشنی ہے۔ میں نے اپنی کمزوریوں کو طاقت بنایا، اور تم نے؟ تم نے اپنی طاقت کو بربادی میں بدل دیا"!

کامران کے دل میں ایک جنگ چھڑ گئی۔ ایک طرف ملکہ کی فریب کار چمک تھی، جو موت کو رومانویت کا لباس پہنا کر پیش کر رہی تھی، اور دوسری طرف یہ مصنفہ تھی، جو زندگی کی اندھیری سرنگ میں روشنی تلاش کر رہی تھی۔

مصنفہ آگے بڑھی اور کامران کے کندھے پر ہاتھ رکھا، " تمہارے پاس بھی انتخاب ہے۔ تم مشکلات کے سامنے جھک سکتے ہو، یا پھر ان پر قابو پا سکتے ہو۔ یہ مت دیکھو کہ زندگی نے تمہیں کیا دیا ہے، بلکہ یہ دیکھو کہ تم زندگی کو کیا دے سکتے ہو"!

کامران کی سوچوں میں ہلچل مچ گئی۔ وہ مزید کچھ کہہ نہیں پایا۔

اچانک، ایک اور بھوت ابھرا۔ اس بار ایک عورت کا۔ گہرے سنہری بال، پُر شکوہ مگر افسردہ چہرہ، آنکھوں میں وہی گہری خاموشی جو کسی ایسے شخص میں ہوتی ہے جس نے زندگی کے ہاتھوں زخم کھائے ہوں۔

"میں شاعرہ ہوں"... اس کی مدھم، درد بھری آواز نے ہوا میں ارتعاش پیدا کیا۔

"میں ایک شاعرہ تھی۔ میری دنیا الفاظ میں بسی تھی۔ مگر زندگی... زندگی نے کبھی مجھے مکمل نہ ہونے دیا۔"

اس کے لہجے میں ایک عجیب سی گونج تھی، جیسے کوئی نظم پڑھتے ہوئے رُک رُک کر سسکیاں لے رہا ہو۔

"میری کہانی شاید تمہیں اپنی لگے، کامران... میں نے ہمیشہ محبت تلاش کی، مگر مجھے صرف زخم ملے۔ بچپن میں باپ کی موت نے میرا دل توڑ دیا، ماں نے پرورش تو کی مگر اس کی سختی نے میرے اندر بغاوت بھر دی۔ محبت ملی، مگر دھوکہ ہوا۔ میں نے ایک شاندار شاعر سے شادی کی، مگر وہ بیوفا نکلا۔ میں نے اپنا سب کچھ قربان کر دیا، اس کی کامیابی میں اپنا خون پسینہ شامل کیا، مگر بدلے میں مجھے تنہائی ملی، بیوفائی ملی، اندھیرا ملا۔"

کامران نے بے اختیار سوال کیا: "تم نے کچھ کیا نہیں؟ تم تو لکھتی تھیں، شاعری تمہاری پناہ تھی"!

شاعرہ کی آنکھوں میں ایک شعلہ سا چمکا، مگر فوراً بجھ گیا۔ "ہاں، میں نے لکھا۔ وہی میری آخری امید تھی۔ مگر کامران، شاعری بھی خالی کاغذ پر خون بہانے جیسی ہوتی ہے۔ جب لفظ بھی تمہیں تسلی نہ دے سکیں، تب تم کہاں جاؤ گے؟ میں زندگی کی ناانصافیوں کے خلاف لڑتی رہی، مگر آخر میں تھک گئی۔ میں نے خود کو ایک کمرے میں بند کیا، چولہے کی گیس کھولی، اور اپنے بچوں کو دوسرے کمرے میں سلا کر ہمیشہ کے لیے سو گئی۔"

ہوا میں جیسے سناٹا چھا گیا۔ کامران کے دل پر ایک بوجھ سا پڑ گیا۔ وہ شاعرہ کو غور سے دیکھنے لگا۔

"تمہارے الفاظ آج بھی زندہ ہیں، تمہاری شاعری آج بھی پڑھی جاتی ہے، مگر تم خود مر گئیں! اگر تم زندہ رہتیں، تو شاید مزید نظمیں لکھتیں، مزید دنیا کو حیران کرتیں"!

شاعرہ نے مدھم مسکراہٹ کے ساتھ سر جھکا دیا۔ "ہاں، شاید۔ مگر میں نے ہار مان لی۔ میں نے سوچا کہ سب کچھ ختم ہو چکا ہے، حالانکہ زندگی ہمیشہ ایک اور موقع دیتی ہے۔ میں وہ موقع نہ لے سکی، مگر تم لے سکتے ہو، کامران"!

کامران کی سانسیں رکنے لگیں۔ یہ کیسا المیہ تھا؟ جو لوگ مر چکے تھے، وہ اب خود اپنی غلطیوں پر افسوس کر رہے تھے؟

کامران کے ذہن میں خیالات کی جنگ چھڑ چکی تھی۔ وہ شاعرہ اور مصور کی دردناک کہانیاں سن چکا تھا، جہاں زندگی ایک بے رحم طوفان تھی، جو حساس روحوں کو بہا کر لے گئی۔ مگر پھر وہ مصنفہ اور افریقی رہ نما کی باتیں بھی سن چکا

تھا— وہ لوگ جنہوں نے زندگی کے شدید طوفانوں میں بھی چراغ جلائے رکھے۔

وہ چٹان پر بیٹھا سمندر کے شور میں اپنے خیالات کو ترتیب دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ لمحہ بہ لمحہ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو رہی تھی۔ خودکشی کا خیال اب بھی کہیں نہ کہیں اس کے دماغ میں تھا، مگر ساتھ ہی جینے کی ایک نئی خواہش بھی جاگ رہی تھی۔

ہوا میں ایک سرگوشی ابھری، جیسے کوئی پرانا دوست اسے پکار رہا ہو:

"اٹھو کامران، لوٹ چلو"!

یہ کس کی آواز تھی؟ وہ نہیں جانتا تھا، مگر یہ آواز اس کے اندر امید کے دیے جلا رہی تھی۔

"زندگی ایک کتاب ہے، ہر صفحے پر دکھ اور خوشی کے الفاظ لکھے ہیں۔ مگر خودکشی وہ ہاتھ ہے جو کتاب کو بیچ میں ہی پھاڑ کر پھینک دیتا ہے۔ کامران، تمہیں اپنی کہانی مکمل کرنی ہے"!

اس کے ذہن میں ایک جھماکا ہوا۔ ہاں، یہ دنیا ایک کہانی کی طرح ہے، اور کہانیوں کو انجام تک پہنچنا چاہیے، نہ کہ انہیں ادھورا چھوڑ دیا جائے!

کامران نے ایک گہری سانس لی، اس کے اندر جیسے کوئی بوجھ ہلکا ہو چکا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ کھڑا ہوا، چٹان کی نوک سے پیچھے ہٹا، اور ساحل کی طرف بڑھنے لگا۔ سمندر کی ہوائیں اب بھی چل رہی تھیں، مگر اب وہ تیز نہیں لگ رہی تھیں، بلکہ جیسے ایک نرم گیت گا رہی تھیں۔

اندھیری رات میں، وہ خاموشی سے قدم اٹھاتا رہا۔ راستے کے کنارے پر پرانے درختوں کی شاخیں جھکی ہوئی تھیں، جیسے وہ اس کے عزم پر سر جھکا رہی ہوں۔

"ہاں، میں جیوں گا"! کامران نے خود سے کہا۔ "نہ صرف جیوں گا، بلکہ اپنی کہانی خود لکھوں گا"!

اس کی رفتار تیز ہو گئی۔ ہر قدم کے ساتھ اس کی ہمت بڑھتی جا رہی تھی۔ کچھ دیر بعد، وہ شہر کی روشن سڑکوں پر آ گیا، جہاں زندگی اپنی پوری رفتار سے دوڑ رہی تھی۔ شہر کی روشنیوں میں کھوئی رات گواہ تھی کہ کامران نے زندگی کے حق میں فیصلہ کر لیا تھا۔ اس کے قدم مضبوطی سے زمین پر تھے، اس کی سانسیں پہلے سے زیادہ ہموار تھیں، اور اس کی آنکھوں میں ایک نیا عزم چمک رہا تھا۔

سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر اس نے اردگرد کی دنیا کو دیکھا— زندگی اپنے پورے جوبن پر تھی۔ دکانیں کھلی تھیں،

لوگ آ جا رہے تھے، چائے کے ہوٹلوں پر قہقہے بلند ہو رہے تھے۔ گاڑیاں روشنیوں کے لمبے دریچے بناتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھیں۔

"میں جیوں گا"! کامران نے دل میں سوچا، اور ایک قدم آگے بڑھایا۔

اچانک...

ایک زوردار ہارن، تیز روشنی، ایک دھندلا منظر—اور پھر ایک دھماکہ!

وقت جیسے رک گیا۔

وہ فضا میں اچھلا، جیسے کسی نادیدہ ہاتھ نے اسے بیدردی سے جھٹک دیا ہو۔ لمحے بھر کو اس کا جسم ہوا میں معلق رہا، جیسے کسی اور جہان میں جانے سے پہلے زمین سے آخری بار رشتہ توڑ رہا ہو۔ پھر وہ سڑک کی سخت سطح سے جا ٹکرایا۔

خون کے قطرے رات کے سیاہ فرش پر بکھر گئے، جیسے کسی نے کسی پرانی کہانی کی روشنائی زمین پر گرا دی ہو۔

شہر کی زندگی بدستور رواں تھی، گاڑیاں گزر رہی تھیں، لوگ چل رہے تھے، اور قہقہے اب بھی بلند ہو رہے تھے۔ مگر سڑک پر ایک بے جان جسم پڑا تھا، جو کچھ لمحے پہلے زندگی کے نئے عہد و پیمان کر رہا تھا۔

وہ جس نے موت کو ٹھکرا دیا تھا، موت نے اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا تھا۔

عقل تمام

رات کا اندھیرا نیلگوں قالین کی مانند اس شہر پر بچھا تھا، مگر اس کے کمرے کی کھڑکیوں سے چھن کر آنے والی روشنی ابھی تک یہ اعلان کر رہی تھی کہ زندگی یہاں جاگ رہی ہے، بے نیاز، بے پروا، اور مغرور۔ وہ ایک عالی شان حویلی کے سب سے بلند و بالا کمرے میں بیٹھا تھا، جہاں سے شہر کے زرد چراغوں کی جھلکیاں ایک خاموش سمندر کی طرح دکھائی دیتی تھیں۔

یہ حویلی ایک عمارت نہیں، ایک داستان تھی۔ اس کے ہر اینٹ، ہر ستون میں اس شخص کی عظمت کی گواہیاں دفن تھیں جسے دنیا ایک عظیم مفکر، مدبر اور صاحبِ عقل شخص کے طور پر جانتی تھی۔ وہ علم کا محافظ تھا، دولت کا امین تھا، سیاست کا بادشاہ تھا، اور گھر کا سربراہ تھا۔

میز پر سنہری قلم چمک رہا تھا، جس سے اس نے کبھی اہم ترین معاہدوں پر دستخط کیے تھے۔ الماریوں میں بند کتابیں ایسے قطار میں کھڑی تھیں جیسے کوئی فوجی دستہ، جن کی ریڑھیاں اس کے علم کی چوکھٹ پر جھکی ہوئی تھیں۔ قالین کے نیچے چھپا قیمتی سنگِ مرمر اور دیواروں پر آویزاں نایاب تصویریں اس کے ذوق اور رتبے کا پتہ دیتی تھیں۔

اس کے بیٹے کامیاب تھے، زندگی میں آگے بڑھ چکے تھے، دوست اس کے گرد پروانوں کی طرح گھومتے، اور سیاست دان اس کے مشوروں کے لیے حاضر رہتے۔ وہ بولتا تو محفل خاموش ہو جاتی، وہ چلتا تو زمین جیسے جھک جاتی۔

آج کل وہ قدرے مضطرب تھا۔ گھڑی کی سوئیاں رات کے دوسرے پہر کی طرف بڑھ رہی تھیں، مگر اس کی آنکھوں میں نیند کا نام و نشان تک نہ تھا۔ وہ جس بستر پر ہر رات پرسکون نیند لیا کرتا تھا، آج اسی بستر پر کروٹیں بدل رہا تھا۔

کمرے کی دیواروں پر سائے ناچ رہے تھے، ہوا میں عجیب سی سرسراہٹ تھی، جیسے کوئی آہستہ آہستہ سرگوشیاں کر رہا ہو۔ پہلے پہل یہ محض بے ضرر سی باتیں لگیں۔ کبھی کبھی اسے محسوس ہوتا کہ کوئی اس کے کان کے قریب آ کر کچھ کہہ کر فوراً پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ کبھی یوں لگتا کہ قالین کے نیچے کوئی سرسراتا ہے، جیسے کوئی سانپ آہستہ آہستہ رینگ رہا ہو۔ وہ جھٹکے سے اٹھ بیٹھتا، مگر کمرے میں صرف خاموشی ہوتی۔

"یہ سب وہم ہے، بس تھکن کا اثر ہوگا،" وہ خود کو تسلی دیتا، مگر بات صرف وہم تک محدود نہ رہی۔

ایک دن ناشتہ کرتے ہوئے اس نے چائے کی پیالی میں عجیب وغریب دھاریاں بنتے دیکھیں، جیسے کوئی خفیہ تحریر ابھر رہی ہو۔ وہ غور سے دیکھنے لگا، دھندلی لکیریں الفاظ میں بدلنے لگیں۔ "وقت قریب آ رہا ہے"! چائے کی سطح پر جھلملاتے یہ الفاظ دیکھ کر اس کے ہاتھ سے پیالی چھوٹ گئی، گرم چائے سفید قالین پر بکھر گئی، مگر وہ بے حس وحرکت اسے تکتا رہا۔

بیٹوں نے محسوس کیا کہ باپ کی حرکات عجیب ہوتی جا رہی ہیں۔ وہ کبھی کھڑے کھڑے کسی غائب شخص سے باتیں کرنے لگتا، کبھی کسی کتاب کو کھول کر اس سے الجھنے لگتا، جیسے وہ الفاظ سے لڑ رہا ہو۔

پھر ایک دن، ایک تقریب کے دوران اس نے سب کے سامنے اچانک قہقہے لگانے شروع کر دیے۔ قہقہے ہنسی میں نہیں، بلکہ دہشت میں بدل گئے۔ "تم سب نادان ہو! وقت قریب آ رہا ہے! وہ آ رہے ہیں، سب کے سب! مجھے خبردار کرنے، مجھے سزا دینے"! اس نے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے اور چیخنے لگا۔

لوگ سمجھے کہ وہ مذاق کر رہا ہے، مگر بیٹے جان گئے کہ معاملہ سنجیدہ ہو چکا ہے۔ اس رات، پہلی بار، انہوں نے فیصلہ کیا کہ والد کو مہمانوں کے سامنے زیادہ بات نہیں کرنے دینی چاہیے۔

"ابا کو آرام کی ضرورت ہے،" بڑے بیٹے نے فیصلہ سنایا۔ "وہ بہت زیادہ سوچ رہے ہیں۔ ہم انہیں کچھ دن الگ رکھیں گے تاکہ وہ سکون سے رہ سکیں۔"

اسی شام، جب وہ اپنی لائبریری میں بیٹھا دیوار پر ہاتھ پھیر رہا تھا، جیسے وہاں کوئی خفیہ دروازہ تلاش کر رہا ہو، تب اچانک دونوکروں نے آ کر اس کے ہاتھ تھام لیے۔

"آپ کو آرام کی ضرورت ہے، ابا جان"! بڑے بیٹے نے نرمی سے کہا، مگر اس کی آواز میں زبردستی کی گونج تھی۔

"کیا مطلب؟ تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟ میں پاگل نہیں ہوں"! وہ جھٹپٹایا، مگر نوکروں کی گرفت مضبوط تھی۔

وہ کمرے کے بیچ کھڑا ہانپ رہا تھا، اس کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔ دروازہ بند تھا، باہر بیٹوں کی سرگوشیاں تھیں، اندر ایک خاموشی جو دماغ پر ہتھوڑے برسا رہی تھی۔

اچانک، دیوار کے کونے میں رکھی ہوئی ایک قدیم طرز کی کرسی آہستہ آہستہ سرکنے لگی۔ پہلے اس کے پائے لمبے ہوئے، پھر لکڑی میں دراڑیں پڑنے لگیں، جیسے اس میں سے کوئی شے نکلنے کو ہو۔ پھر کرسی کی پشت جھکنے لگی، لکڑی نرم ہوتی گئی، اور ایک ہیبت ناک سایہ اس میں سے نمودار ہونے لگا۔

وہ ایک دیو قامت شخصیت تھی، آنکھوں میں وحشت، داڑھی بکھری ہوئی، شان و شوکت کا پرانا لبادہ بدن پر جھول رہا تھا۔ اس کے پیروں میں زنجیریں تھیں، جیسے وہ کسی قید سے ابھی ابھی آزاد ہوا ہو۔

" کون۔۔۔کون ہو تم؟" اس نے دیوار سے لگتے ہوئے سرگوشی کی۔

اس کی آواز گرجدار تھی، جیسے بادلوں کے بیچ آندھی بول رہی ہو۔

" تم مجھے نہیں پہچانتے؟ میں ابن صنم ہوں جس نے بابل کی اینٹ سے اینٹ بجائی تھی، جس نے اپنے نام سے تخت و تاج کا وقار بلند کیا تھا۔ لوگ مجھے سجدے کرتے تھے، میری رعایا میرے اشاروں پر سر جھکاتی تھی۔ میں نے بابل کے معلق باغات تعمیر کروائے، جنہیں دنیا کا ساتواں عجوبہ کہا جاتا ہے۔ مگر میں۔۔۔"

اس کے چہرے پر کرب ابھرا، وہ چند لمحے خاموش رہا، جیسے کوئی ناقابلِ بیان یاد اسے جکڑ رہی ہو۔ پھر وہ آگے بڑھا اور کانپتی ہوئی آواز میں بولا:

" مگر میں پاگل ہو گیا! ہاں، میں جس نے بادشاہت کے پرچم بلند کیے تھے، ایک دن جنگلوں میں جانوروں کی طرح گھاس کھانے پر مجبور ہو گیا۔ میں، جو دنیا کا سب سے طاقتور شخص تھا، وہ سات سال تک دربدر بھٹکتا رہا۔ ناخن بڑھ گئے، بال پرندوں کے پروں کی مانند ہو گئے، اور میرے ہوش و خرد کا زوال ہو گیا۔"

ابن صنم اب جھک کر قریب آ چکا تھا، اس کی آنکھیں دہک رہی تھیں۔

" میں نے اپنے غرور کا خمیازہ بھگتا، میں نے اپنی طاقت کو خدا سمجھا، مگر قدرت نے مجھے ایسا سبق سکھایا کہ میں درندوں سے بدتر ہو گیا۔ اور تم۔۔۔ تم بھی وہی انجام پانے والے ہو"!

" نہیں"! اس نے چیخ کر کہا، پسینے میں بھیگا ہوا۔

وہ ہنسا، ایک ایسی ہنسی جس میں ہول تھا، دہشت تھی۔

"تم بھی میرے راستے پر ہو! تمہاری زبان پر ابھی تک طاقت کا زہر ہے، تمہیں لگتا ہے کہ دنیا تمہاری غلام ہے، مگر وہ وقت قریب ہے جب تمہیں احساس ہوگا کہ تم کچھ بھی نہیں ہو، تمہارا انجام بھی وہی ہوگا جو میرا ہوا"!

"نہیں! میں تمہاری طرح نہیں ہوں"!

غصے میں اس نے جھپٹ کر وہ کرسی اٹھائی، جس سے ابن صنم نمودار ہوا تھا، اور پوری طاقت سے اسے دیوار پر دے مارا۔ لکڑی ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی، اور ابن صنم کی شکل ایک لمحے کو بگڑی، پھر دھواں بن کر کمرے میں تحلیل ہوگئی۔

ابن صنم کی لرزہ خیز ہنسی ابھی تک دیواروں میں گونج رہی تھی، مگر وہ اسے نظر انداز کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا، مگر اس نے خود کو یقین دلایا کہ سب کچھ صرف ایک وہم ہے۔

تبھی میز پر رکھی ہوئی سیاہ روشنائی کی دوات کپکپانے لگی۔

پہلے اس کی سطح میں ہلچل پیدا ہوئی، جیسے پانی میں کوئی حرکت ہو رہی ہو، پھر اس کے کنارے پھیلنے لگے۔ روشنائی اندر ہی اندر بلبلوں کی صورت میں ابلی، اور اچانک ایک چیخ کے ساتھ دوات پھٹ گئی۔ اس سیاہ مائع کی دھاریں ہوا میں معلق ہوگئیں، اور پھر جیسے کوئی غیر مرئی ہاتھ انہیں جوڑ رہا ہو، وہ دھیرے دھیرے انسانی شکل اختیار کرنے لگیں۔

"میں مرد قوی ہوں"!

یہ ایک بوڑھا آدمی تھا، اس کا لباس قدیم رومی شان و شوکت کا آئینہ دار تھا، مگر بدن پر کپڑے بکھرے ہوئے، بال الجھے ہوئے، اور آنکھوں میں ایک ایسی وحشت تھی جو عقل اور جنون کے بیچ معلق تھی۔ وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولا:

"مجھے تاریخ نے رومن سلطنت کے احمق ترین بادشاہ کے طور پر یاد رکھا ہے، مگر میں نادان نہیں تھا۔ میری زندگی میں عیش و عشرت بھی تھی اور طاقت بھی، مگر قسمت نے مجھے ہمیشہ ایک کٹھ پتلی بنا کر رکھا۔ میں اپنے ہی دربار میں اپنے ہی ساتھیوں کے سامنے مذاق بن گیا۔ سب مجھ پر ہنستے تھے، میرے فیصلوں کا مذاق اڑاتے تھے، مجھے پاگل سمجھتے تھے"!

وہ قریب آیا، آنکھیں بھٹی کی طرح دہک رہی تھیں۔

"اور آخر میں، میں واقعی پاگل ہوگیا۔ دھیرے دھیرے میری عقل ساتھ چھوڑ گئی، میرا ذہن خیالات کے جال میں الجھ گیا۔ میں سمجھتا تھا کہ میرے اپنے ہی لوگ مجھے مار ڈالیں گے۔۔۔ اور وہی ہوا! میری بیوی، جسے میں نے بے حد چاہا، اسی نے مجھے زہر دے کر مار دیا"!

"یہ سب تمہاری کمزوری تھی"! وہ غصے میں دھاڑا۔

مردقوی کی آنکھوں میں زہر بھری مسکراہٹ ابھری، جیسے اسے پہلے ہی معلوم ہو کہ وہ کیا کہنے والا ہے۔

"اورتم؟ تم کمزور نہیں ہو؟ تمہیں لگتا ہے کہ تم پر کوئی ہنس نہیں رہا؟ تمہیں لگتا ہے کہ لوگ تمہیں سنجیدگی سے لیتے ہیں؟ تم غلط ہو! تم بھی میری طرح ایک بھولے بادشاہ ہو، جس کے ذہن میں وہم بھرے جا رہے ہیں، اور جس کے اپنے بیٹے اسے قید کر رہے ہیں! وہ وقت دور نہیں جب تم بھی میری طرح پاگل کہلاؤ گے اور تمہارا انجام بھی ایسا ہی ہوگا"!

" بکواس بند کرو"!

غصے میں اس نے میز پر رکھا ہوا قلم اٹھایا، وہی قلم جس کے ساتھ وہ اپنی یادداشتیں لکھا کرتا تھا، اور اسے پوری قوت سے مردقوی کی طرف پھینک دیا۔

قلم ہوا میں معلق ہو گیا، اور جیسے ہی مردقوی کے سینے سے ٹکرایا، اس کا پورا وجود سیاہ روشنائی میں تحلیل ہو گیا۔ سیاہی دھویں میں تبدیل ہوئی اور کمرے کی فضا میں بکھر گئی۔

کمرے کی فضاء میں ابھی بھی مردقوی کی تحلیل شدہ سیاہی کی بو رچی ہوئی تھی۔ وہ کانپتے ہاتھوں سے اپنی پیشانی کو تھامے بیٹھا تھا، مگر سکون کہاں!

اچانک، کونے میں رکھی تلوار خود بخود ہلنے لگی۔

پہلے تو وہ آہستہ آہستہ لرزی، جیسے کسی نادیدہ قوت نے اسے چھوا ہو، پھر وہ زوردار آواز کے ساتھ فرش پر گری اور اپنی ہی نوک پر گھومنے لگی، جیسے کسی نامعلوم جادوئی چکر میں آ چکی ہو۔ تلوار کی دھار سرخ ہونے لگی، جیسے اس پر کسی نے تازہ خون انڈیل دیا ہو۔

پھر وہی ہوا جو پہلے ہو چکا تھا۔ تلوار کا دستہ ایک انسانی ہاتھ میں تبدیل ہوا، دھار ایک لمبی ناک اور لرزتے ہونٹوں میں ڈھل گئی، اور یکدم ایک خوفناک شخصیت نمودار ہو گئی——

میں دہشت خان ہوں۔ سامنے کھڑا شخص قدآور تھا، اس کے شانوں پر بھاری شاہی لباس تھا، مگر چہرہ زرد اور آنکھیں سرخ، جیسے انگارے دہک رہے ہوں۔

" کیا تم جانتے ہو کہ میرے نام کے ساتھ 'خوف ناک' کیوں جڑا؟" اس نے دانت پیستے ہوئے پوچھا۔

وہ خاموش رہا، مگر دہشت خان نے اپنی لرزتی آواز میں خود ہی جواب دیا:

" کیونکہ میں نے ہر اس شخص کو فنا کر دیا جس پر مجھے شبہ تھا، چاہے وہ میرا بیٹا ہی کیوں نہ ہو"!

یہ کہہ کراس نے اپنی لرزتی انگلی اپنے ماتھے کی طرف اٹھائی، جہاں ایک پرانا زخم تھا۔

"یہ نشان میرے اپنے بیٹے کا خون ہے۔۔۔ میں نے اسے مار ڈالا، صرف اس خوف سے کہ کہیں وہ میری سلطنت چھین نہ لے"!

"اور پھر میں؟ میں خود؟ میں اپنی ہی ذہنی دیواروں میں قید ہو گیا، اپنے ہی سائے سے ڈرنے لگا۔ ہر آواز دشمن لگنے لگی، ہر نظر میں سازش نظر آتی۔ میں نے دیوانگی میں آخری سانس لی، اور مرنے سے پہلے مجھے صرف موت کی خالی آنکھیں دکھائی دیں"!

دہشت خان کا سایہ لمبا ہوتا جا رہا تھا، اس کے چہرے پر وہی سفاک مسکراہٹ تھی جو اس کے ہاتھوں مرنے والے بے گناہوں کے خون میں بسی ہوئی تھی۔

"تم بھی میری طرح ہو! تم بھی شک میں مبتلا ہو، تم بھی ہر آہٹ پر چونک اٹھتے ہو، تم بھی سوچتے ہو کہ لوگ تم پر ہنس رہے ہیں، تم پر قابو پا رہے ہیں! مگر حقیقت یہ ہے کہ تم پر ہنسا نہیں جا رہا۔۔۔ تمہیں بھلا دیا جا رہا ہے"!

"نہیں"! وہ چیخا، اس کا سانس پھولنے لگا۔

دہشت خان نے اپنی انگلی اٹھائی اور ہوا میں کوئی علامت بنائی، جیسے اس کی تقدیر پر آخری مہر لگا رہا ہو۔

"تمہیں دیوانگی مار ڈالے گی! تم اسی کمرے میں پاگل پن میں سسک سسک کر مرو گے"!

"بند کرو بکواس"! وہ غصے میں لپکا اور فرش پر گری ہوئی تلوار کو اٹھا کر پوری قوت سے ایوان پر دے ماری۔

چمکدار دھار دہشت خان کے سینے میں پیوست ہو گئی، مگر وہ چیخنے کے بجائے ہنسنے لگا۔

دھیرے دھیرے، اس کا وجود تلوار کے اندر جذب ہوتا چلا گیا، جیسے وہ کبھی تھا ہی نہیں۔ بس ایک آخری جملہ فضا میں معلق رہ گیا:

"تمہارے انجام کا وقت قریب آ رہا ہے۔۔۔"

کمرے میں گھمبیر خاموشی چھا چکی تھی۔ زمین پر ٹوٹی ہوئی تلوار کی دھار اب بھی چمک رہی تھی، جیسے دہشت خان کی منحوس ہنسی اس میں قید ہو۔ وہ ہانپ رہا تھا، پیشانی پر پسینہ تھا، مگر ایک لمحے کے لیے اسے لگا کہ شاید یہ سب کچھ ختم ہو چکا ہے۔۔۔

مگر پھر، دیوار پر لٹکی پرانی گھڑی نے حرکت شروع کر دی۔

لمحہ بہ لمحہ اس کی سوئیاں بے ترتیب گھومنے لگیں، جیسے وقت کسی نامعلوم دائرے میں قید ہوگیا ہو۔ سوئیاں ایک دوسرے کو کاٹ رہی تھیں، آگے پیچھے بھاگ رہی تھیں، جیسے کوئی نظر نہ آنے والی قوت ان پر قابض ہوگئی ہو۔

پھر اچانک، گھڑی کا شیشہ چٹخا، اور اس کے اندر سے دھواں سا نکلا۔

"ہا۔۔۔ہا۔۔۔ہا۔۔۔"

ہلکی مگر لرزتی ہوئی ہنسی گونجی، جیسے صدیوں پرانی کوئی دیوانگی اس قید سے آزاد ہوگئی ہو۔ اور پھر۔۔۔

گھڑی کے اندر سے ایک لمبا، سفید بالوں والا، نیلی آنکھوں والا بوڑھا نمودار ہوا۔

"میں ہوں شاہ سوم"!

وہ چمکدار نیلے شاہی لباس میں ملبوس تھا، مگر اس کی آنکھیں سرخ تھیں، جیسے نیند اور سکون صدیوں سے اس پر حرام ہو چکے ہوں۔ اس کے چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ تھی، جو خوشی اور دکھ کا عجیب امتزاج تھی۔

"میں وہ بادشاہ تھا، جس نے دنیا پر راج کیا، مگر اپنی ہی ذہنی حالت پر قابو نہ رکھ سکا"! وہ بڑبڑایا۔

وہ سر کو ہلانے لگا، جیسے کسی نامعلوم دھن پر جھوم رہا ہو۔

" کیا تم جانتے ہو کہ میں نے کیسے اپنی ہوش کھوئی؟ نہیں جانتے؟ آؤ، میں بتاتا ہوں۔۔۔"

"یہ سب خاموشی میں شروع ہوا۔ پہلے مجھے لگا کہ میں خود سے باتیں کر رہا ہوں، پھر مجھے لگا کہ کوئی اور بھی میرے ساتھ بات کر رہا ہے۔ مگر کمرہ خالی تھا۔ میں نے نوٹ لکھنا شروع کیے، طویل نوٹ۔۔۔ فضول، بے ترتیب، بے معنی الفاظ۔۔۔ وہ الفاظ جو میرے ہی سر میں گونج رہے تھے۔

میں لوگوں پر شک کرنے لگا۔ درباریوں پر، مشیروں پر، حتیٰ کہ اپنے ہی بیٹوں پر! میں نے چیخ چیخ کر حکم دیے، وہ احکامات جو کسی کے بھی سمجھ میں نہ آسکے۔

'جوتے کھڑکیوں پر رکھو'!

' گھوڑے سے کہو کہ وہ عدالت میں حاضر ہو'!

'خود کو پانی میں دیکھو، تاکہ تم جان سکو کہ تم ہو بھی یا نہیں'!

مگر سب سے خطرناک لمحہ وہ تھا۔۔۔ جب میں نے خود کو آئینے میں دیکھا، اور وہاں کوئی اور کھڑا تھا"!

"میں دیوانہ ہو چکا تھا"!

"اور پھر وہ دن آیا جب میں نے اپنی کرسی کے پائے گننے شروع کر دیے۔۔۔اور وہ بڑھتے ہی چلے گئے۔۔۔چار سے آٹھ، آٹھ سے سولہ۔۔۔وہ بڑھتے گئے، پھیلتے گئے، یہاں تک کہ پوری زمین کرسی کے پیروں میں بدل گئی۔۔۔اور میں اس کے نیچے دب گیا"!

شاہ سوم نے اپنے سر کو دونوں ہاتھوں میں جکڑ لیا، اس کی آنکھیں بے حد خوفناک لگنے لگیں۔

"جانتے ہو میں نے کیسے دم توڑا؟ میں نے چیختے ہوئے آخری سانس لی، مگر میرے درباریوں نے میرا جنازہ ایک پاگل شخص کے طور پر اٹھایا! ایک ایسا بادشاہ، جس کی سلطنت وسیع تھی، مگر دماغ ایک اندھیری کوٹھڑی میں قید تھا"!

وہ آگے بڑھا، اور اس کے کان میں سرگوشی کی:

"تم بھی میری طرح ہو! تم بھی خود کو سمجھدار سمجھتے ہو، مگر کیا تم واقعی ہو؟ کیا تمہارا ذہن بھی تم سے سازش نہیں کر رہا؟ کیا تم بھی دیوانگی کے سمندر میں غرق نہیں ہو رہے؟"

"بند کرو بکواس"! وہ چیخا اور گھڑی کو پوری طاقت سے دیوار پر دے مارا۔

گھڑی چکنا چور ہو گئی۔

لیکن کمرے میں اب بھی ایک بازگشت گونج رہی تھی۔۔۔

"دیوانگی۔۔۔دیوانگی۔۔۔دیوانگی تمہاری تقدیر ہے۔۔۔"!

گھڑی کا شیشہ چکنا چور ہو چکا تھا، مگر کمرے میں اب بھی ایک ناقابلِ فہم بازگشت موجود تھی۔ وہ پسینے میں شرابور زمین پر بیٹھا ہانپ رہا تھا۔ یکا یک، کتابوں کی الماری لرزنے لگی۔

پہلے ہلکی سی جنبش، پھر کتابیں ایک ایک کر کے نیچے گرنے لگیں۔ الفاظ بکھر رہے تھے، جیسے کسی صدیوں پرانی دانش کی ہڈیاں کرچیاہٹ کے ساتھ زمین پر گر رہی ہوں۔

پھر اچانک، الماری کے درمیان ایک گہری دراڑ پڑی اور اس میں سے دھند سی نکلنے لگی۔

دھند میں ایک ہیولا بنا، اور پھر ایک دبلا پتلا شخص نمودار ہوا—

میرا نام وجودی ہے۔ اس نے اعلان کیا۔

لمبے کوٹ میں لپٹا، بے ترتیب مونچھوں والا ایک شخص، جس کی آنکھوں میں شدید اضطراب اور دیوانگی کی چمک تھی۔ اس کا چہرہ زرد پڑ چکا تھا، جیسے وہ ایک ایسی حقیقت دیکھ چکا ہو جو انسانوں کے بس سے باہر ہو۔

وہ بولا، مگر اس کی آواز زمین کے اندر سے آتی محسوس ہوئی:

" کیا تم نے کبھی کسی خدا کو مرتے دیکھا ہے؟ میں نے دیکھا ہے"!

اس کی آنکھیں دہکنے لگیں۔

"میں نے اعلان کیا تھا کہ 'خدا مر چکا ہے'! اور انسان اس حقیقت کو برداشت نہ کر سکا۔"

وہ آگے بڑھا، کتابوں کے ڈھیر پر کھڑا ہو گیا اور بلند آواز میں بولا:

"میں نے کہا کہ اخلاقیات ایک دھوکہ ہیں، مذہب ایک افسانہ ہے، اور انسان کو اپنی تقدیر خود تخلیق کرنی ہوگی۔۔۔مگر میں خود اس بوجھ کو نہ سہ سکا"!

اس کی آواز گونجی، جیسے کسی کھنڈر میں گرج چمک رہی ہو۔

"میں نے حقیقت کو ٹکڑوں میں دیکھا، میں نے دنیا کو ایک ابدی چکر میں قید پایا۔ ہر لمحہ، ہر سانس، بار بار دہرائی جانے والی ایک ناقابلِ برداشت قید۔۔۔"

اس کی آنکھیں وحشت سے پھیل گئیں۔

"اور پھر وہ دن آیا۔۔۔جب میں نے خاموشی کو توڑنے کی کوشش کی، مگر میری زبان میرا ساتھ چھوڑ چکی تھی۔ میں نے لکھنا چاہا، مگر میرے ہاتھوں نے بغاوت کر دی۔ میں نے چیخنا چاہا، مگر صرف سرگوشیاں نکلیں"!

وہ لڑکھڑایا، جیسے صدیوں کی تھکن اس پر طاری ہو گئی ہو۔

"اور آخر میں، میں پاگل خانے میں قید کر دیا گیا۔۔۔ایک ایسا عاقل، جس نے کائنات کو نئی نظر سے دیکھنے کی کوشش کی، مگر خود اپنی ہی سوچ میں دفن ہو گیا"!

وہ دیوانہ وار ہنسا، پھر اچانک خاموش ہو گیا۔

"اور اب۔۔۔تم"!

وہ آہستہ آہستہ اس کے قریب آیا اور دھیرے سے سرگوشی کی:

"دیوانگی تمہیں بھی جکڑ رہی ہے۔ تم بھی میرے راستے پر چل رہے ہو۔ سوال کرو، مگر جواب نہ پاؤ۔۔۔سوچو، مگر پاگل ہو جاؤ۔۔۔آخر میں، تم بھی میری طرح ہو جاؤ گے"!

"نہیں۔۔۔میں تم نہیں ہوں"! وہ چلایا۔

اس نے ایک کتاب اٹھا کر اس کے چہرے پر دے ماری، مگر جیسے ہی کتاب اس کے چہرے سے ٹکرائی، وجودی دھوئیں میں تحلیل ہو گیا۔

وہ ہانپتا ہوا الماری سے پیچھے ہٹا۔ وجودی کا سایہ تحلیل ہو چکا تھا، مگر اس کی کھوکھلی ہنسی اب بھی کمرے میں گونج رہی تھی۔

دیوار پر ایک تصویر جھولنے لگی، جیسے کوئی بےچین روح اس میں قید ہو۔

اس کی پشت کی طرف سرسراہٹ کی آواز آئی، اس کے مڑ کر دیوار کی طرف دیکھا جہاں ایک تصویر پھنکار رہی تھی۔ تصویر کا کینوس آہستہ آہستہ پھیلنے لگا، رنگ بکھرنے لگے، جیسے کسی خواب نے حقیقت میں سرایت کر لی ہو۔

رنگوں کے بھنور سے ایک شخص برآمد ہوا۔ پہلے صرف سر، پھر گردن، پھر کندھے۔۔۔ اور آخر میں ایک مکمل ہیولا، جس کی آنکھیں کسی انجانی وحشت سے لبریز تھیں۔

میں مصور ہوں، تصویر سے بننے والے سائے نے کہا۔

دھوئیں کے سائے میں کھڑا مصور، سرخ داڑھی، زرد چہرہ، اور بدن پر پرانے کپڑے۔ مگر سب سے نمایاں چیز تھی—اس کا کان!

دائیں طرف کان موجود نہیں تھا، بس ایک زخم کا نشان باقی تھا، جہاں سے خون بہتا نظر آ رہا تھا۔

"میں نے اسے کاٹ دیا"! مصور کی بھاری آواز کمرے میں گونجی۔

وہ آگے بڑھا اور سرگوشی کی مانند بولا:

"تم جانتے ہو کیوں؟ کیونکہ میرے اندر شور بہت زیادہ تھا! وہ آوازیں جو میرے دماغ میں تھیں، وہ مجھے مار رہی تھیں۔۔۔ میں نے اپنے آپ کو خاموش کرنے کے لیے یہ کیا"!

اس کی آواز کپکپا رہی تھی، جیسے کوئی کھنڈر خود اپنی کہانی سنانے پر مجبور ہو۔

"مجھے کوئی سمجھ نہ سکا، کوئی نہ جان سکا کہ میری تصاویر میں رنگ کیوں رقص کرتے ہیں، کیوں ہر شے میں ایک سراب سا بہتا ہے۔۔۔ کیوں میری راتیں تاریک نہیں بلکہ ستاروں کی روشنی سے جھلملا رہی ہیں"!

وہ لڑکھڑایا، جیسے کوئی بوجھ اس کے کندھوں پر ہو۔

"مجھے قید نہیں کیا گیا۔۔۔ مگر میں خود اپنی تنہائی کا قیدی بن گیا"!

"اور آخر میں۔۔۔ میں نے فیصلہ کر لیا"!

اس کی آنکھیں خلا میں گھورنے لگیں۔

"ایک دن میں نے ایک پستول اٹھایا۔۔۔اور اپنے سینے پر رکھ لیا۔۔۔"

وہ اپنی پسلیوں پر ہاتھ رکھتا ہے، جہاں سے خون بہنے کا دھوکہ ہو رہا تھا۔

"میں نے خود کو گولی ماردی۔۔۔تاکہ میرے اندر کا شور ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے"!

وہ تیزی سے آگے بڑھا، اور آدمی کے کان میں سرگوشی کی:

"تم بھی میرا راستہ اختیار کرو گے! یہ کمرہ تمہاری قبر بنے گا، تمہارے بیٹے تمہیں بھول جائیں گے، اور آخر میں، تم بھی انہی آوازوں سے تنگ آکر خود کو ختم کر لو گے"!

"نہیں"!!!

وہ چیخا، اور غصے میں فرش پر پڑی تصویر کو پھاڑ دیا۔

مصور ایک چیخ کے ساتھ ہوا میں تحلیل ہو گیا، مگر دیوار پر اس کے رنگ اب بھی زندہ تھے۔۔۔

مصور کے جانے کے بعد کمرے میں ایک عجیب سی خاموشی چھا گئی، جیسے وقت کچھ لمحوں کے لیے تھم گیا ہو۔

مگر یہ خاموشی زیادہ دیر قائم نہ رہی۔

میز پر پڑی بیاض کے صفحات تیزی سے پلٹنے لگے۔۔۔پھر اچانک رک گئے! جیسے کسی نے ان پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔ اس کی جلد پر دراڑیں پڑنے لگیں، الفاظ دھندلانے لگے۔۔۔اور پھر۔۔۔کاغذ کی سطح پر ایک انسانی ہاتھ نمودار ہوا!

دھیرے دھیرے ایک سراپا ابھرا، کمر جھکی ہوئی، لمبے بکھرے ہوئے بال، الجھی ہوئی داڑھی، اور خوف سے بھرپور آنکھیں!

میرا نام تاجر پروازی ہے، میں وہ شخص ہوں جس نے دنیا پر حکمرانی کی تھی — ہوائی جہازوں کا بادشاہ، فلموں کا شہنشاہ، جس کی دولت کا کوئی شمار نہ تھا۔ "دولت۔۔۔شہرت۔۔۔اختیار۔۔۔سب کچھ تھا میرے پاس"!

"میں دنیا کے لیے ایک داستان تھا، مگر اپنی دنیا میں، میں صرف ایک قیدی تھا۔۔۔اپنے ہی دماغ کا قیدی"!

اس کی آواز تھکی ہوئی، مگر تیز تھی۔

"میں نے اونچائیوں کو چھوا، آسمان کی وسعتوں میں پرواز کی، مگر پھر زمین پر گر گیا۔۔۔خود اپنے ہی خوف کے ہاتھوں برباد"!

"میں نے اپنی دولت کے باوجود خود کو چار دیواری میں قید کر لیا۔۔۔ پردوں کے پیچھے چھپ گیا۔۔۔ روشنی سے ڈرنے لگا۔۔۔ انسانوں سے نفرت کرنے لگا"!

"میں نے لوگوں کو چھوڑا، مگر میرے خوف نے مجھے نہیں چھوڑا"!

"مجھے جراثیم کا خوف تھا۔۔۔ میں ہر چیز کو بار بار دھوتا۔۔۔ اپنے ہاتھ، اپنے کپڑے، حتیٰ کہ اپنی یادیں بھی"!

"میرے اردگرد کی دیواریں سکڑتی جا رہی تھیں۔۔۔ میرے اندر کا اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔۔۔ اور میں۔۔۔ ایک بے بس کٹھ پتلی بن چکا تھا"!

وہ ہانپنے لگا، جیسے یادوں کا بوجھ اس کی سانسیں روک رہا ہو۔

"آخر میں۔۔۔ میں نے اپنے آخری دن ایک کمرے میں گزارے۔۔۔ اکیلا۔۔۔ بالکل تنہا۔۔۔ جہاں صرف دیواریں تھیں اور میں تھا۔۔۔"

اس نے سر اٹھایا اور آدمی کی آنکھوں میں جھانکا:

"اور تم۔۔۔ تم بھی میری طرح ہو! تمہاری دولت، تمہاری طاقت۔۔۔ سب بے معنی ہو چکی ہے"!

"آخر میں۔۔۔ تم بھی اسی کمرے میں قید رہو گے۔۔۔ اور اسی تنہائی میں مر جاؤ گے"!

آدمی نے غصے سے ڈائری اٹھائی اور پوری قوت سے دیوار پر دے ماری!

پروازی کی شبیہ لمحہ بھر کو جھلملائی، پھر دھوئیں میں تحلیل ہو گئی۔

پروازی کے دھوئیں میں تحلیل ہونے کے بعد کمرے میں ایک گہری خاموشی چھا گئی۔ مگر یہ سکون طوفان سے پہلے کی خاموشی تھی۔

وہ قلم۔۔۔ جو ایک عرصے سے میز پر ساکت پڑا تھا۔۔۔ لرزنے لگا!

پھر۔۔۔ ایک جھٹکے سے خود بخود حرکت میں آ گیا!

یہ قلم ماضی کی ایک داستان لکھنے جا رہا تھا۔۔۔ ایک ایسی کہانی جس کے الفاظ ابھی باقی تھے!

کالی روشنائی میز پر پھیلنے لگی۔۔۔ اور اسی سیاہ دھند سے ایک شبیہ ابھرنے لگی!

لمبا قد، سفید داڑھی، سوچتی آنکھیں، ایک کسان کے لباس میں ملبوس۔۔۔

مزدک شیر!

اس نے نمودار ہوتے ہی اعلان کیا۔

"میں نے زندگی کو سمجھنے کی کوشش کی۔۔۔مگر زندگی نے مجھے سمجھنے نہ دیا"!

اس کی آواز میں صدیوں کی تھکن تھی، جیسے وہ اپنے الفاظ کے بوجھ تلے دبا جا رہا ہو۔

"میں نے ایک زمیندار کے گھر میں آنکھ کھولی۔۔۔دولت، عزت، شہرت۔۔۔سب کچھ میرے قدموں میں تھا۔۔۔ مگر یہ سب بے معنی تھا"!

"میں نے جنگیں دیکھیں، میں نے فتح وشکست کے کھیل دیکھے۔۔۔مگر مجھے نظر آیا کہ انسان خود اپنی جنگ ہار رہا ہے"!

"میں نے ناول لکھے، افسانے تخلیق کیے۔۔۔میں نے زندگی کے ہر رنگ کو بیان کرنے کی کوشش کی۔۔۔مگر جو رنگ میرے اندر تھا، وہ کوئی نہ دیکھ سکا"!

اس کی آنکھیں آدمی کی آنکھوں میں گڑ گئیں۔

"میں نے سب کچھ چھوڑ دیا۔۔۔شان وشوکت، دولت، زمینیں۔۔۔سب کچھ"!

"میں نے سادہ زندگی گزارنی چاہی، غریبوں کے ساتھ رہنا چاہا۔۔۔مگر میرے اپنے ہی چاہنے والوں نے مجھے پاگل سمجھا"!

"آخر میں، میں سب سے دور بھاگ نکلا۔۔۔ایک ٹرین کے اسٹیشن پر، برف میں پڑا ہوا، مرتے وقت میرے پاس کچھ بھی نہ تھا۔۔۔سوائے پچھتاوے کے"!

"اور تم؟ کیا تم بھی پچھتاوے کے ساتھ مرنا چاہتے ہو؟"

آدمی کے چہرے پر خوف کی پرچھائیاں ناچنے لگیں، مگر وہ بپھر گیا۔

"میں پاگل نہیں ہوں"! اس نے چلاّ کر کہا۔ "میں تمہاری طرح بے بس نہیں ہوں"!

اس نے پوری قوت سے میز پر رکھی قلم اٹھائی اور زمین پر دے ماری!

مزدک شیر کی شبیہ ایک لمحے کے لیے کانپی۔۔۔اور پھر الفاظ کی مانند ہوا میں بکھر گئی۔

مگر ہوا میں اس کی آخری سرگوشی گونج رہی تھی:

"الفاظ مر سکتے ہیں۔۔۔مگر پاگل پن ہمیشہ زندہ رہتا ہے"!

مزدک شیر کی سرگوشی ابھی ہوا میں تحلیل ہی ہو رہی تھی کہ کمرے میں ایک عجیب سی تبدیلی آ گئی۔

دیوار پر لٹکی ہوئی عددی مساوات لرزنے لگی!

پھر۔۔۔مساوات کے اعداد حرکت میں آ گئے!

7...3...9...5 یہ سب اکٹھے ہونے لگے، جیسے کوئی نادیدہ قوت انہیں ترتیب دے رہی ہو!

اچانک، دیوار پر لکھا ایک عدد تیزی سے پھیلنے لگا، جیسے روشنائی پانی میں گھل رہی ہو!

اور پھر۔۔۔اس عدد کے اندر سے ایک چہرہ ابھرا!

ہلکا سا جھکا ہوا قد، ذہین آنکھیں، مگر ان میں ایک عجیب سی بے قراری، جیسے کوئی ایسی چیز دیکھ رہا ہو جو دنیا کو نظر نہ آتی ہو۔۔۔

وہ یحی مہندسی تھا

"کیا تم بھی حقیقت کو دیکھ سکتے ہو؟"

اس کی آواز میں ایک گہرا اسرار تھا۔

آدمی نے بے بسی سے سر جھٹکا، مگر نیش کی نظریں اس کے دماغ کے اندر جھانک رہی تھیں۔

"میں ایک ریاضی دان تھا۔۔۔ایک نابغہ، ایک ذہین ترین انسان۔۔۔میں نے ایسی مساواتیں تخلیق کیں جو دنیا نے پہلے کبھی نہ دیکھی تھیں"!

"میرے دماغ میں دنیا کی ہر پہیلی کا جواب تھا۔۔۔مگر ایک دن۔۔۔میرا ہی دماغ میرے خلاف ہو گیا"!

"مجھے وہ چیزیں نظر آنے لگیں جو دنیا میں موجود نہیں تھیں۔۔۔میں نے وہ آوازیں سننی شروع کر دیں جو صرف میرا وہم تھیں۔۔۔"

"میں جان گیا تھا کہ میرا دماغ دھوکہ دے رہا ہے۔۔۔مگر میں اس دھوکے سے بچ نہیں سکا"!

آدمی کا بدن لرزنے لگا۔

"سالہا سال میں نے اپنی حقیقت کے ساتھ جنگ لڑی۔۔۔کبھی میں جیتا، کبھی وہ"!

"یہی جنگ تمہارے اندر بھی جاری ہے۔۔۔تمہارے خیالات، تمہاری یادیں، تمہاری حقیقت۔۔۔سب تمہیں دھوکہ دے رہے ہیں"!

"تم بھی میری طرح ایک مساوات ہو۔۔۔مگر کیا تمہاری مساوات حل ہو سکتی ہے؟"

"نہیں"! آدمی چیخا۔ "میں تمہاری طرح پاگل نہیں ہوں"!

اس نے غصے میں دیوار پر لٹکی ہوئی مساوات پر گھونسہ مارا!

دیوار پر موجود تمام اعداد بکھر گئے۔۔۔اور مہندسی کی شبیہ تحلیل ہوگئی!

مگر اس کی آخری سرگوشی ابھی باقی تھی:

"پاگل پن کوئی مساوات نہیں۔۔۔جسے حل کیا جا سکے"!

مہندسی کی آخری سرگوشی ابھی فضا میں تحلیل ہو رہی تھی کہ اچانک کمرے کی فضا بدلنے لگی۔

ہوا میں ایک غیر مرئی سی سیاہی پھیلنے لگی، جیسے کسی نے رات کے اندھیرے کو پانی میں گھول دیا ہو۔

کمرے کی دیوار پر لٹکی کالی بلی کی ایک پرانی تصویر دھیرے دھیرے متحرک ہونے لگی۔

پھر۔۔۔اس تصویر کی آنکھیں جھپکیں!

آدمی کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں!

بلی کی تصویر میں سے ایک خوف ناک سائے نے جنم لیا۔۔۔ایک طویل کوٹ پہنے، تیز نگاہوں والا شخص، جس کی آنکھوں میں درد کے بادل تیر رہے تھے۔

یہ طاؤس اسراری تھا

"کیا تم بھی اندھیرے کو دیکھ سکتے ہو؟"

اس کی آواز کسی قبرستان کے سنسان گوشے میں چلنے والی ہوا جیسی تھی۔۔۔

آدمی کانپ گیا۔ "تم۔۔۔کون ہو؟"

طاؤس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھری، مگر وہ کسی ایسے شخص کی مسکراہٹ تھی جو زندگی کے کھیل سے بیزار ہو چکا ہو۔

"میں طاؤس اسراری ہوں۔۔۔میں نے کہانیاں تخلیق کیں، ایسی کہانیاں جن میں حقیقت اور وہم کی سرحدیں مدھم ہو گئیں"!

"میں نے اندھیرے کی زبان کو سمجھا۔۔۔میں نے موت کے قدموں کی آہٹ سنی۔۔۔میں نے روشنی کی تلاش میں خود کو اندھیرے میں جھونک دیا"!

آدمی نے گھبرا کر پیچھے ہٹنا چاہا، مگر طاؤس کی آواز میں جکڑنے والی طاقت تھی۔

"میں تنہائی میں جیا۔۔۔میں نے ہر اس شے کو کھو دیا جو میری تھی"!

"میری محبت مر گئی۔۔۔میری خوشی فنا ہو گئی۔۔۔میری دنیا ایک ایسا سایہ بن گئی جس میں صرف اندھیرا تھا"!

"اور پھر۔۔۔میں نے خود کو موت کے حوالے کر دیا"!

طاؤس کے چہرے پر ایک تلخ مسکراہٹ ابھری۔

"کیا تمہیں لگتا ہے کہ تمہاری کہانی مجھ سے مختلف ہو گی؟"

آدمی کی آنکھوں میں ایک بے یقینی کا سایہ لہرایا۔

طاؤس نے آگے بڑھ کر اس کے کان میں سرگوشی کی:

"تم بھی میری طرح پاگل ہو جاؤ گے۔۔۔تم بھی اندھیرے میں ڈوب جاؤ گے۔۔۔"

"اور ایک دن۔۔۔تمہاری کہانی بھی ختم ہو جائے گی"!

آدمی غصے میں چیخا: "نہیں! میں تمہاری طرح کمزور نہیں! میں پاگل نہیں ہوں"!

"میں پاگل نہیں ہوں"!

"میں پاگل نہیں ہوں"!!!

اس نے دیوار پر موجود تصویر کو پوری قوت سے نوچ کر زمین پر دے مارا! طاؤس کی شبیہ لرزی، بکھری۔۔۔اور اندھیرے میں تحلیل ہو گئی۔

مگر اس کی آخری سرگوشی دیواروں میں گونجتی رہی:

"اندھیرا تمہیں کبھی تنہا نہیں چھوڑے گا۔۔۔"

کمرے میں موت کی سی خاموشی تھی۔

دیواریں زخمی ہو چکی تھیں، فرنیچر ٹوٹ چکا تھا، اور کمرے میں بکھرے ہوئے ٹکڑوں میں وہ تمام اشیاء پڑی تھیں جو کبھی ان دیوانہ وار کہانیوں کے پیغامبر بنے تھے۔

اور درمیان میں۔۔۔آدمی بے حس و حرکت زمین پر پڑا تھا۔

جب اس کے بیٹے کمرے میں داخل ہوئے اس کی روح پرواز کر چکی تھی۔

عجیب جانور

کہیں کائنات کی وسعتوں میں، ایک ایسا سیارہ آباد تھا جہاں حیوانات کی ایک وسیع سلطنت قائم تھی۔ یہ کوئی عام سیارہ نہ تھا، بلکہ ایک ایسا خطہ زمین تھا جہاں ممالیہ، پرندے، رینگنے والے جاندار، کیڑے مکوڑے اور آبی حیات سبھی ایک ساتھ بستے تھے۔ یہاں نہ کوئی کم تر تھا اور نہ ہی کسی ایک مخلوق کو دوسری پر کوئی فوقیت حاصل تھی—— کم از کم بظاہر یہی محسوس ہوتا تھا۔

یہاں کے جنگل، میدان، پہاڑ، دریا اور سمندر ہر مخلوق کے لیے یکساں تھے۔ شیروں کی گرجتی دھاڑوں کے درمیان ہاتھیوں کی دانشمندانہ خاموشی، بھیڑیوں کی اجتماعی دوڑ، گھوڑوں کی سبک روی، کتوں کی وفاداری اور بلیوں کی چالاکی ہر طرف نظر آتی۔ آسمان میں عقاب اونچی اڑان بھرتے تو الو درختوں کے سائے میں غور و فکر کرتے۔ سانپ اور مگرمچھ چپ چاپ گھات لگاتے، جبکہ چیونٹیاں اور مکھیاں مصروفِ عمل رہتیں۔ سمندروں میں ڈولفن کھیلتی، شارک شکاری کی طرح گھومتی، اور ہشت پا کسی چٹان کے پیچھے چھپ کر اپنی حکمت عملی تیار کرتا۔

یہ سیارہ ایک توازن کے ساتھ چل رہا تھا، یہاں تک کہ ایک دن، ایک بحث نے اس سکون کو درہم برہم کر دیا۔ ہر جانور نے محسوس کیا کہ وہ سب سے افضل ہے، سب سے برتر ہے، سب سے زیادہ قیمتی ہے۔ لیکن کس میں سب سے زیادہ خوبیاں تھیں؟ کس میں سب سے زیادہ خامیاں؟ یہ طے ہونا ابھی باقی تھا۔

یہ بحث ایک عام دن کے آغاز میں ہوئی، جب تمام جانور اپنے اپنے معمولات میں مصروف تھے۔ مگر ایک جگہ، جنگل کے بیچوں بیچ ایک وسیع میدان میں، مختلف جانور جمع ہونا شروع ہوئے۔ شیر ایک بڑے پتھر پر بیٹھا اپنی دھاڑ کے ساتھ

اپنے جاہ وجلال کا اظہار کر رہا تھا، جبکہ ہاتھی اپنی گہری آنکھوں سے سب کو دیکھ رہا تھا۔عقاب بلندی پر بیٹھا نیچے جھانک رہا تھا، اور بھیڑیا اپنی جماعت کے ساتھ قریب کھڑا سب کی حرکات کو پرکھ رہا تھا۔

پہلے پہل تو محض ہلکی پھلکی گفتگو رہی، لیکن جلد ہی ہر جانور اپنی بڑائی ثابت کرنے پر تل گیا۔کوئی اپنی طاقت کا ذکر کر رہا تھا، کوئی اپنی دانشمندی کا، کوئی اپنی رفتار اور کوئی اپنی حکمتِ عملی کا۔

اچانک، شیر نے دھاڑ کر کہا:

"یہ بحث ختم کرو! سب جانتے ہیں کہ جنگل کا بادشاہ میں ہوں۔میری قیادت، بہادری، اور حکمت کسی اور میں نہیں۔"

مگر اس سے پہلے کہ شیر اپنی بڑائی مکمل کر پاتا، بھیڑیا آگے بڑھا اور کہا:

"لیڈر وہ نہیں ہوتا جو اکیلا کھڑا ہو، بلکہ وہ ہوتا ہے جو اپنی جماعت کے ساتھ مل کر چلتا ہے۔میری طرح۔"

اتنے میں ہاتھی نے اپنی گونجتی آواز میں کہا:

"قیادت اور بہادری اہم ہیں، مگر یاد رکھو، اصل طاقت دانشمندی میں ہے۔میں صدیوں کا علم اور تجربہ رکھتا ہوں"!

اسی دوران، پرندے، رینگنے والے جانور، اور پانی کی مخلوقات بھی اس بحث میں شامل ہونے لگے۔بات بڑھتی گئی، ہر جانور اپنے فضائل بیان کرتا، اور ساتھ ہی دوسرے جانوروں کی خامیوں کی نشاندہی کرتا۔

یہ دیکھ کر جنگل کے سب سے بوڑھے اور دانا جانور، الو، نے اپنی سرگوشی جیسی آواز میں کہا:

"اگر واقعی سب سے بہترین جانور کا تعین کرنا ہے، تو کیوں نہ ہر ایک اپنی خصوصیات خود بیان کرے، اور دوسرے اس کی خامیوں کی نشاندہی کریں؟

اس کی خوبیوں اور خامیوں کی تعداد کا موازنہ کر لیا جائے گا پھر معلوم ہوگا کہ کون سب سے برتر ہے۔"

یہ تجویز سب کو پسند آئی۔اور یوں، جانوروں کی طویل تقاریر اور ایک عجیب وغریب فیصلے کا آغاز ہوا۔

میدان کے عین وسط میں ایک بلند و بالا تخت رکھا گیا تھا، جس پر جنگل کا سب سے قدیم اور غیر جانبدار بادشاہ براجمان تھا۔اس کے سامنے ایک وسیع کھلا میدان تھا، جہاں تمام جانور جمع تھے۔فیصلہ طے پایا کہ ہر جانور اپنی خوبیاں خود بیان کرے گا، اور جیسے ہی وہ اپنی فضیلت کا ذکر کرے گا، دوسرے فوراً اس کی خامیوں کی نشاندہی کریں گے۔بادشاہ ان تمام خوبیوں کو ایک طرف اور خامیوں کو دوسری طرف جمع کرتا جائے گا۔

شیر تخت کے قریب آیا، اپنی گردن بلند کی، اور بلند آواز میں بولا:

"میں جنگل کا بادشاہ ہوں! میری بہادری، طاقت، اور قیادت کی مثالیں دی جاتی ہیں۔ میں اپنے علاقے کا محافظ ہوں، میں دشمنوں کو للکارتا ہوں، میں شکار میں سب سے آگے ہوں۔ میری ایک دھاڑ ہی سب کو خوف میں مبتلا کر دیتی ہے۔"

ابھی اس کی بات مکمل بھی نہ ہوئی تھی کہ دوسرے جانوروں نے اس پر آوازیں کسنی شروع کر دیں:

بھیڑیا ہنسا: "بہادری؟ تمہارے پاس طاقت ہے، مگر تم تنہا کچھ نہیں کر سکتے! طاقتور تو میں بھی ہوں، مگر میری اصل خوبی میری جماعت ہے"!

ہاتھی نے سر جھٹکا: "قیادت؟ یہ کیسی قیادت ہے کہ تم دوسروں پر ظلم کرتے ہو، اپنے غصے میں کسی کو بھی چیر پھاڑ دیتے ہو"!

ہرن بولا: "تم صرف اپنی برتری قائم رکھنے کے لیے دوسروں کو دباتے ہو۔ یہ لیڈرشپ نہیں، یہ غرور ہے"!

شیر نے غصے میں ان کی طرف دیکھا، مگر بادشاہ نے اس کی خوبیوں کو الگ رکھا اور خامیوں کو دوسری طرف ڈال دیا۔

ہاتھی دھیرے دھیرے آگے بڑھا اور گہری آواز میں بولا:

"میں جنگل میں سب سے زیادہ دانشمند اور یادداشت میں سب سے مضبوط ہوں۔ میں نے نسلوں کا علم محفوظ رکھا ہے، میں اپنے خاندان کا وفادار ہوں، اور اپنے ساتھیوں کی بھرپور مدد کرتا ہوں۔ میرا دل نرم ہے اور میں دوسروں کا دکھ سمجھتا ہوں۔"

مگر دوسرے جانوروں نے جلدی سے اس کی کمزوریاں بیان کر دیں:

شیر نے طنزیہ کہا: "دانشور ہو، مگر بعض اوقات اتنے ضدی ہو جاتے ہو کہ دوسروں کی بات ہی نہیں سنتے"!

سانپ نے سرسراہٹ کی: "تم اپنے غصے میں آ کر پورے درخت جڑ سے اکھاڑ سکتے ہو، پھر یہ رحم کہاں گیا؟"

عقاب نے بلند آواز میں کہا: "یادداشت میں بہترین ہو، مگر اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ تم بدلے کے جذبات رکھتے ہو اور کبھی کبھار کسی بات کو بھول نہیں پاتے"!

بادشاہ نے پھر خوبیوں کو ایک طرف اور خامیوں کو دوسری طرف ڈال دیا۔

بھیڑیا فخریہ انداز میں بولا:

"میں جنگل میں سب سے زیادہ گروہ بانی میں مہارت رکھتا ہوں! میں اپنی جماعت کے ساتھ رہتا ہوں، نظم و ضبط کا

قائل ہوں، اور میری وفاداری بے مثال ہے۔ میں مشکلات میں بھی اپنی جماعت کا ساتھ نہیں چھوڑتا"!

مگر دوسرے جانور اس پر بھی تنقید کرنے میں پیچھے نہ رہے۔

کتا ہنسا، "وفاداری کی بات کرتے ہو؟ لیکن اگر کوئی اور طاقتور آ جائے، تو تم موقع پرست بن کر اپنی جماعت بھی بدل سکتے ہو"!

ہرن بولا: "تمہاری اجتماعی سوچ کبھی کبھی تمہیں اندھی تقلید میں لے آتی ہے، تم خود سوچنے کے بجائے اپنے سردار کے حکم پر چلتے ہو"!

بادشاہ نے حسبِ دستور اس کی خوبیوں اور خامیوں کو الگ الگ رکھ دیا۔

عقاب نے اپنی بلند نظری پر فخر کرتے ہوئے کہا:

"میں سب سے زیادہ بلند نظر ہوں۔ سب سے زیادہ مرتکز ہوں، اور میری پرواز کی بلندی کوئی نہیں چھو سکتا! میں ایک سچا شکاری ہوں، جو صرف بہترین کو چنتا ہے"!

مگر دوسرے جانوروں نے فوراً ردِعمل دیا۔

الو نے گہری سانس لی: "اونچائی پر رہنے سے کیا حاصل؟ تم تنہا ہو، کسی کے ساتھ نہیں"!

کوا بولا: "مرتکز؟ یا پھر ضد؟

تم ہمیشہ اپنی ہی راہ پر چلتے ہو، کسی کو ساتھ لے کر نہیں چل سکتے"!

بادشاہ نے اس کی خوبیوں کو اکٹھا کیا اور ایک طرف ڈال دیا جب کہ خامیوں کو دوسری طرف۔

عقاب کے بعد ایک شاندار گھوڑا آگے بڑھا۔ اس کی چمکدار کھال سورج کی روشنی میں چمک رہی تھی، اور اس کی بڑی، ذہین آنکھوں میں ایک عجیب سی کشش تھی۔ اس کی ایال ہوا میں لہرا رہی تھی، اور اس کے مضبوط ٹانگوں میں غیر معمولی قوت دکھائی دے رہی تھی۔

"میری سب سے بڑی خوبی میری رفتار اور استقامت ہے۔ میں تھک کر ہار نہیں مانتا، چاہے جتنی بھی مشکلات کیوں نہ ہوں۔ میرا دل نرم ہے، مگر میرا جسم طاقتور ہے۔ میں کسی کا ساتھ نہیں چھوڑتا اور ہمیشہ اپنی لگام تھامے رکھتا ہوں"!

بھیڑ میں سے کسی نے کہا، "مگر تم ہمیشہ ایک گروہ کے محتاج ہوتے ہو! اور جب خوف محسوس کرتے ہو تو بھاگ کھڑے ہوتے ہو۔ تمہاری وفاداری بھی کبھی کبھی بوجھ بن جاتی ہے، کیونکہ تم وہیں رکتے ہو جہاں تمہیں کوئی قابو میں رکھے"!

بادشاہ نے خاموشی سے خوبیوں کو ایک طرف رکھا اور خامیوں کو دوسری طرف۔

اب میدان میں ایک کتا کود کر آیا۔ اس کے چمکدار دانت نمایاں تھے، اور اس کی دم جوش و خروش سے ہل رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں بے پناہ چمک تھی، جیسے ہر وقت اپنے مالک کی حفاظت کے لیے تیار ہو۔

"میری سب سے بڑی خوبی میری وفاداری ہے! میں ہمیشہ اپنے دوستوں کے ساتھ کھڑا رہتا ہوں، ان کی حفاظت کرتا ہوں، اور انہیں کبھی نہیں چھوڑتا۔ میں اپنے ساتھی کے لیے جان بھی دے سکتا ہوں"!

بلی نے زور سے قہقہہ لگایا، "ہاں! مگر تمہاری یہی خوبی تمہیں محتاج بنا دیتی ہے۔ تمہیں ہر وقت اپنے مالک کی ضرورت ہوتی ہے، اور اگر کوئی تم سے زیادہ توجہ حاصل کرے تو تم حسد میں مبتلا ہو جاتے ہو! کیا یہ واقعی طاقت ہے؟"

بادشاہ نے دونوں باتیں سن کر خاموشی سے خوبیوں اور خامیوں کو ان کے متعلقہ ڈھیروں میں ڈال دیا۔

ایک چالاک بلی اپنے مخصوص انداز میں آہستہ آہستہ میدان میں اتری۔ اس کی چمکدار سبز آنکھیں چمک رہی تھیں، اور وہ اپنی نفیس حرکات سے دوسرے جانوروں کو متاثر کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"میں آزاد ہوں، خود مختار ہوں، اور ہر مشکل میں اپنا راستہ خود تلاش کر سکتی ہوں۔ میں دوسروں پر انحصار نہیں کرتی، میں خود فیصلہ کرتی ہوں کہ کب کہاں جانا ہے"!

الو نے سر جھکا کر کہا، " مگر تم اتنی آزاد ہو کہ تمہیں کسی کی پرواہ ہی نہیں! تم ہمیشہ اپنی مرضی سے کام کرتی ہو، اور جب کسی کو تمہاری ضرورت ہو تو تم غائب ہو جاتی ہو۔ کیا خود غرضی کو آزادی کہا جا سکتا ہے؟"

بادشاہ نے دونوں باتوں کو الگ کر کے ڈھیروں میں رکھ دیا۔

ایک بھاری بھرکم دریائی گھوڑا دلدل سے نکل کر میدان میں آیا۔ اس کا جسم طاقت سے بھرپور تھا، اور اس کی چمکدار جلد پر پانی کے قطرے جھلملاتے نظر آ رہے تھے۔

"میں طاقتور ہوں! میں پانی اور زمین دونوں پر راج کرتا ہوں۔ میری قوت اور میرے دانت کسی کو بھی خوف زدہ کر سکتے ہیں"!

مگرمگرمچھ نے غرانا شروع کیا، " مگر تمہاری یہی طاقت بعض اوقات تباہی مچا دیتی ہے۔ تم اپنی طاقت کا استعمال اکثر غصے میں آ کر کرتے ہو، اور جب تم بپھر جاتے ہو، تو اپنے ہی علاقے کو نقصان پہنچا دیتے ہو"!

بادشاہ نے خوبیوں اور خامیوں کو الگ کر کے رکھ دیا۔

ریچھ اپنی بھرپور جسامت اور طاقت کے ساتھ میدان میں داخل ہوا۔اس کا قد لمبا،جسم چوڑا،اور آنکھوں میں سنجیدگی تھی۔اس کے بڑے،تیز پنجے زمین پر نشان چھوڑ رہے تھے،اور وہ اپنے دبدبے سے سب کو متاثر کر رہا تھا۔

"میری سب سے بڑی طاقت میرا ضبط اور میری خود کفالت ہے۔میں اپنے وسائل پر گزارا کرتا ہوں،ضرورت پڑے تو جنگل کے سب سے خطرناک شکاریوں کا مقابلہ کرسکتا ہوں۔میں اپنی طاقت کو بے جا استعمال نہیں کرتا،مگر جب وقت آئے تو میں کسی کو بھی پچھاڑ سکتا ہوں"!

بھیڑیا ہنسا اور کہا،" مگر تم حد سے زیادہ تنہائی پسند ہو،اور تمہاری یہی خود کفالت تمہیں دوسروں سے دور کر دیتی ہے۔تم اپنی مرضی کے مالک ہو،مگر کبھی کبھار یہ ضد نقصان دہ بھی ہوسکتی ہے"!

بادشاہ نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے ریچھ کی خوبیوں اور خامیوں کو الگ کر کے رکھ دیا۔

اب ایک چالاک اور سیاہ کوّا میدان میں اترا۔اس کی آنکھوں میں شرارت تھی،اور وہ کسی نہ کسی سازش میں مگن نظر آ رہا تھا۔

"میں سب سے زیادہ ذہین ہوں! میں ہر مسئلے کا حل نکال سکتا ہوں، میں جو چاہوں حاصل کرسکتا ہوں،اور میں سخت سے سخت حالات میں بھی زندہ رہ سکتا ہوں"!

مگر مور نے گردن اکڑاتے ہوئے کہا،" مگر تمہاری یہ چالاکی کبھی کبھار دھوکہ دہی بن جاتی ہے۔تم دوسروں کے وسائل چرا کر آگے بڑھتے ہو،موقع پرستی تمہاری فطرت بن چکی ہے،اور تمہارا مکارپن دوسروں کو نقصان پہنچا سکتا ہے"!

بادشاہ نے کوّے کی خوبیوں اور خامیوں کو الگ کر دیا۔

میدان کے قریب ایک مگرمچھ اپنی سخت کھال اور زبردست جبڑوں کے ساتھ پانی سے نکل آیا۔اس کی آنکھیں سکون سے سب کو دیکھ رہی تھیں،جیسے وہ ہر چیز کو پرکھ رہا ہو۔

"میں انتظار کا بادشاہ ہوں! میں صبر کرتا ہوں، میں اپنے شکار پر اچانک جھپٹتا ہوں،اور جب میں کوئی موقع دیکھوں تو اس سے بھرپور فائدہ اٹھاتا ہوں"!

ہاتھی نے سر ہلاتے ہوئے کہا،" مگر تم بہت ظالم ہو،تم موقع پرست ہو،اور تم دوسروں کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھاتے ہو۔تم میں رحم نہیں،تم صرف اپنا فائدہ دیکھتے ہو"!

بادشاہ نے خاموشی سے مگرمچھ کی خوبیوں اور خامیوں کو بھی تقسیم کر دیا۔

ایک چمکدار، خوش مزاج دولفن پانی سے اچھل کر میدان میں آئی۔ اس کی حرکتوں میں ایک عجیب مسرت تھی، اور اس کی آنکھوں میں ہمدردی چمک رہی تھی۔

"میں سب سے زیادہ ملنسار اور سمجھدار ہوں! میں دوسروں کے ساتھ خوش رہتی ہوں، میں سب کی مدد کرتی ہوں، اور میں اپنے اردگرد کے ماحول کو بہتر بنانے میں یقین رکھتی ہوں"!

مگر ایک شارک نے تیز آواز میں کہا، " مگر تمہاری ملنساری بعض اوقات بے وقوفی میں بدل جاتی ہے! تم دوسروں کی بہت زیادہ فکر کرتی ہو، اور بعض اوقات تم اپنی حد سے بڑھ کر دوسروں کی مدد میں مگن ہو جاتی ہو، جس سے تم خود نقصان اٹھاتی ہو"!

بادشاہ نے دولفن کی خصوصیات کو بھی دو الگ حصوں میں رکھ دیا۔

اب سمندر کی ایک اور طاقتور مخلوق، ایک زبردست شارک پانی سے نکل کر سامنے آئی۔ اس کی چمکدار جلد اور خونخوار آنکھیں سب کو گھور رہی تھیں۔

"میں سب سے زیادہ خطرناک ہوں، میں سب سے بڑی مچھلی ہوں، میں اپنا شکار کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتی، میں فیصلہ کرتی ہوں اور میں ہی سب پر راج کرتی ہوں"!

مگر کچھوے نے سر اٹھایا اور بولا، " مگر تم ظالم ہو، تمہیں دوسروں کا کوئی خیال نہیں، تم صرف شکار کرنے میں دلچسپی رکھتی ہو اور تمہاری یہی سخت گیری تمہیں دوسروں سے الگ کر دیتی ہے"!

بادشاہ نے شارک کی طاقت اور اس کی سختی کو دو الگ حصوں میں بانٹ دیا۔

اب ایک مصروف شہد کی مکھی بھنبھناتی ہوئی آئی۔ وہ تیزی سے ادھر ادھر اڑ رہی تھی، اس کے چھوٹے مگر مستعد پروں میں ایک الگ ہی جان تھی۔

"میں سب سے زیادہ محنتی ہوں! میں دن رات کام کرتی ہوں، میں اپنی کالونی کے لیے قربان ہو سکتی ہوں، اور میں دوسروں کے لیے شیریں شہد تیار کرتی ہوں"!

مگر چیونٹی نے سر ہلایا اور بولی، " مگر تم ضرورت سے زیادہ محنت کرتی ہو، بعض اوقات حد سے زیادہ مشقت تمہیں تھکا دیتی ہے، اور اگر تمہیں چھیڑا جائے تو تم بہت جارحانہ ہو جاتی ہو"!

بادشاہ نے مکھی کی خوبیاں اور خامیاں بھی الگ کر دیں۔

اب ایک مکڑی اپنے ریشمی جال سے جھولتی ہوئی نیچے آئی۔ اس کی آٹھ آنکھیں چمک رہی تھیں، اور اس کی حرکات میں چالاکی تھی۔

"میں سب سے زیادہ صبر کرنے والی اور ماہر تخلیق کار ہوں! میں اپنے جال خود بنتی ہوں، میں شکار کا انتظار کرتی ہوں، اور میں بڑی چالاکی سے زندگی گزارتی ہوں"!

یوں ہر جانور آیا، اپنے فضائل بیان کیے، اور دوسرے جانوروں نے ان پر تنقید کر کے خامیوں کو بے نقاب کیا۔ ہر خوبی ایک طرف رکھی گئی، اور ہر خامی دوسری طرف۔ یہاں تک کہ پوری زمین پر دو بڑے ڈھیر لگ گئے—ایک خوبیوں کا، دوسرا خامیوں کا۔

تمام جانور حیران تھے کہ دونوں ڈھیر تقریباً برابر تھے۔ ہر ایک میں کوئی نہ کوئی خوبی ضرور تھی، مگر خامیوں سے بھی کوئی مبرّا نہ تھا۔

میدان میں دو بڑے ڈھیر پڑے تھے—ایک خوبیوں کا، دوسرا خامیوں کا۔ جانور ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے، کچھ ندامت محسوس کر رہے تھے، کچھ فخر میں کھڑے تھے، اور کچھ الجھن میں تھے کہ آخر اس کا کیا فیصلہ ہوگا۔

تبھی، ایک تیز اور گہری گرج دار آواز فضا میں گونجی، جیسے کسی غیر معمولی شے نے زمین کو چیر کر باہر قدم رکھا ہو۔ تمام جانور چونک کر اس طرف متوجہ ہوئے۔

ایک عجیب مخلوق نمودار ہوئی...

اس کا جسم دو مختلف رنگوں میں تقسیم تھا—دائیں جانب کا حصہ چمکدار، سفید، اور بیحد خوبصورت تھا، جبکہ بایاں حصہ بدصورت، تاریک اور مکروہ نظر آ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں عجیب تھیں، دائیں آنکھ روشنی بکھیر رہی تھی، مگر بائیں آنکھ میں ایک پراسرار تاریکی تھی۔ اس کے ہاتھ لمبے، انگلیاں نوکیلی، اور حرکات غیر متوقع تھیں۔

جانور اس کو دیکھ کر دم بخود رہ گئے۔ کسی نے اس جیسی مخلوق پہلے کبھی نہ دیکھی تھی، اس جیسا جان ور کبھی نہ سوچا تھا۔ وہ جان دار آہستہ آہستہ آگے بڑھا، اور بغیر کسی توقف کے سیدھا بادشاہ کے بنائے ہوئے دو ڈھیروں کی طرف لپکا۔

پہلے اس نے خوبیوں کا ڈھیر اٹھایا اور اپنی چمکدار، خوبصورت دائیں جانب کے جسم میں جذب کر لیا۔ اس کا سفید حصہ مزید چمکدار ہو گیا، جیسے کسی نے اس پر روشنی کی ایک اضافی تہہ چڑھا دی ہو۔

پھر وہ خامیوں کے ڈھیر کی طرف جھکا، اور یکدم انہیں اپنی تاریک بائیں جانب میں جذب کر لیا۔ جیسے ہی وہ خامیوں کو

اپنے اندر سمو رہا تھا، اس کے بائیں حصے کی سیاہی مزید گہری ہوتی گئی، جیسے اندھیرا اور گہرا ہوتا جا رہا ہو۔
یہ دیکھ کر جانور حیران رہ گئے۔ کچھ پیچھے ہٹ گئے، کچھ نے خوف سے دم سادھ لیا۔ مگر اس عجیب جانور کے چہرے پر ایک پراسرار مسکراہٹ ابھری، جیسے وہ پہلے سے جانتا ہو کہ ایسا ہی ہوگا۔
پھر، بغیر کچھ کہے، وہ اچانک تیز رفتاری سے دوڑنے لگا، اس کی چمک اور تاریکی ایک ساتھ لرز رہی تھیں۔ میدان میں موجود جانور اسے حیرت اور خوف سے دیکھ رہے تھے۔ وہ کہاں جا رہا تھا؟ یہ کون تھا؟ کیوں اس نے تمام خوبیاں اور خامیاں اپنے اندر جذب کر لیں؟
جنگل کی حدوں سے گزرتے ہوئے وہ عجیب جانور غائب ہو گیا۔ اس کی روشنی اور تاریکی ایک ساتھ جھلملا رہی تھی، اور پھر وہ ایک دھند میں تحلیل ہو گیا۔
جانور سکتے میں کھڑے تھے۔ آخر وہ کیا شے تھی؟ اور وہ سب کچھ لے کر کہاں گئی؟
الو نے سرگوشی کی:
"وہ سب کچھ لے گیا... اچھائی بھی، برائی بھی، نیکی بھی بدی بھی، خوبی بھی خامی بھی، روشنی بھی تاریکی بھی! اتنا بڑا اور اتنا طاقتور پیٹ ہے اس کا! وہ کیا شے تھی!
ہاتھی نے گہری سانس لی اور آسمان کی طرف دیکھا، جیسے کسی بھید کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو۔
شیر نے پہلی بار کسی اور کی طاقت کے آگے خاموشی اختیار کر لی۔
اور تمام جانوروں کے ذہن میں ایک ہی سوال گونج رہا تھا:
" کیا یہ مخلوق ہی سب سے برتر تھی؟ یا پھر بدتر!

اندھے چراغ

کہکشاؤں کے اس بے کنار سلسلے میں، جہاں وقت اپنی حدت کھو چکا تھا، ایک سیارہ خلا میں معلق تھا۔اس کی زمین نہ سخت تھی، نہ نرم، بلکہ کسی بھولی بسری یاد کی مانند تھی، جو محسوس تو ہو، مگر گرفت میں نہ آئے۔نہ یہاں سورج تھا، نہ چاند، نہ ستارے، مگر روشنی کسی نامعلوم منبع سے آکر ہر شے پر یوں بکھرتی جیسے اندھیرے کو ہمیشہ کے لیے مٹا چکی ہو۔دھند کی دبیز تہہ ہر طرف پھیلی تھی، جس کے پیچھے نہ کوئی شہر تھا، نہ پہاڑ، نہ دریا۔ایک سناٹا تھا جو آوازوں کو نگل لیتا تھا، ایک خلا تھا جو ہر شے کو بے وزن کر دیتا تھا۔

اس سیارے کی سطح پر ایک مخلوق موجود تھی۔وہ سیارے کی سطح پر چلتی، مگر قدموں کا کوئی نشان پیچھے نہ چھوڑتی۔وہ دیکھتی، مگر اس کی آنکھیں نظر نہ آتی تھیں۔اس کا وجود تھا، مگر اس کی کوئی واضح شکل نہ تھی۔کبھی وہ روشنی کی ایک مدھم لکیر معلوم ہوتی، کبھی دھوئیں کی مانند تحلیل ہوتی، کبھی کسی پرچھائیں کی طرح خاموشی سے حرکت کرتی۔اس کے وجود میں کوئی سختی تھی، نہ نرمی، بلکہ ایک عجیب سی کیفیت تھی جیسے وہ خود بھی مکمل نہ ہو۔

یہ مخلوق زمین پر چلتی رہی، دھند میں گم، کسی سمت، کسی منزل کے بغیر۔اس کی حرکات میں کوئی ہلچل نہ تھی، کوئی اضطراب نہ تھا، بس ایک مسلسل خاموشی تھی، جیسے کوئی گمشدہ خیال ہو، جو کبھی مکمل نہ ہو سکا ہو۔

دور کہیں، خلا کے کنارے پر مبہم آوازیں گونجنے لگیں۔دھند کے پیچھے کچھ سرگوشیاں ہوئیں، پہلے مدھم، پھر تیز، اور پھر اتنی واضح کہ گویا خود کو منوانے پر مصر ہوں۔وہ آوازیں روشنیوں کے چراغ تھے جو خود کو مشعل راہ سمجھتے تھے، سب اپنے فہم پر نازاں تھے۔ایک کہتا، "میں جانتا ہوں کہ یہ مخلوق کیا ہے۔اس کا ماضی، اس کا حال، اس کا مستقبل سب میری دسترس

میں ہے۔" دوسرا ہنستا اور کہتا، "تم محض وہ دیکھ سکتے ہو جو سطح پر ہے، مگر میں اس کی گہرائیوں کو سمجھ سکتا ہوں۔" تیسرا چمک کر کہتا، "تم سب اندھیرے میں ہاتھ پیر مار رہے ہو، حقیقت تو میں جانتا ہوں۔"

روشنی کا ہر ہیولا اپنے آپ کو حتمی سمجھتا تھا، اور دوسروں کو غلط۔ وہ سب کسی پوشیدہ حقیقت پر گرفت پانے کے لیے بیقرار تھے۔

دھند کے اُس پار، وہ مخلوق ساکت کھڑی سب سنتی رہی۔ وہ سب اسی کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے، مگر اسے ان کی زبان سمجھ نہ آتی تھی۔ یا شاید وہ خود کسی اور زبان میں گم تھا، کسی اور حقیقت میں۔

اچانک روشنی کا ایک دائرہ چمکا، اور اس کے مرکز سے ایک سایہ ابھرا۔ یہ سایہ رفتہ رفتہ ایک واضح شکل اختیار کر گیا—ایک دراز قد، بارعب ہستی، جس کے چہرے پر بے پناہ خود اعتمادی کی چمک تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک آئینہ تھا، جو مسلسل اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم رہا تھا۔ اس کے لباس پر پیچیدہ نقش و نگار بنے تھے، جیسے وہ خود ہی کائنات کی سب سے بڑی گتھی کو سلجھانے والا ہو۔

"میں فہمِ ذات کا پیامبر ہوں"! وہ گرجدار آواز میں بولا۔ "یہ مخلوق اپنے عمل، اپنی فطرت اور اپنے مستقبل کو کیسے سمجھ سکتی ہے؟ آئینہ ہی اس کا جواب ہے! یہ جو بھی کرتی ہے، اس کا اصل محرک اس کے اندر چھپی ہوئی وہ خواہشات ہیں جنہیں وہ خود نہیں سمجھ پاتی۔ میں نے ان گہرائیوں کو کھنگالنے کا ہنر سیکھ لیا ہے، اور میں کہتا ہوں کہ اس مخلوق کے تمام فیصلے، تمام جذبات، تمام اضطراب صرف اس کے اندرونی لاشعوری تصادم کی پیداوار ہیں۔"

اس نے آئینے کو بلند کیا اور بولا، "یہ مخلوق اپنے بچپن میں دبائے گئے احساسات کے سائے میں زندہ رہتی ہے۔ اس کے خوف، اس کے رجحانات، اس کی نفرتیں اور محبتیں سب اسی دائرے سے نکلتی ہیں۔ اگر اسے سمجھنا ہے، تو اس کی اندرونی پرتیں کھولنی ہوں گی۔ ماضی کی جڑوں میں جھانکنا ہوگا، خوابوں کی رمزوں کو پڑھنا ہوگا، اور اس کی پوشیدہ نفسیاتی گتھیاں سلجھانی ہوں گی۔ صرف میں، صرف میں، اس کا مکمل ادراک رکھتا ہوں"!

یہ کہتے ہی فضا میں ہلچل ہوئی۔ دیگر ہیولوں کے سائے دھیرے دھیرے حرکت میں آئے، جیسے کوئی بھید بھری سرگوشی سننے کو بے تاب ہوں۔ پھر ایک اور سایہ آگے بڑھا، اس کی آنکھوں میں تیزی تھی اور آواز میں ہلکی سی طنزیہ مسکراہٹ۔

"تم کہتے ہو کہ یہ مخلوق صرف اپنے لاشعوری خیالات کی غلام ہے؟" وہ تمسخر آمیز لہجے میں بولا۔ "یہ کہاں لکھا ہے کہ یہ صرف دبے جذبات اور خوابوں کی بنا پر حرکت کرتی ہے؟ تم تو اسے ایک ایسا بے اختیار پتلا بنا رہے ہو جس کے تار ماضی

کے کسی ان دیکھے ہاتھ میں ہیں! نہیں، نہیں! یہ مخلوق اپنے اردگرد کے محرکات سے متحرک ہوتی ہے، یہ ماحول سے سیکھتی ہے، اس کے ردعمل خارجی دنیا کے تابع ہیں، نہ کہ کسی نامعلوم تاریک غار کے۔ تمہارا آئینہ دھندلا ہے، دوست"!

اس کے پیچھے ہٹتے ہی خلا میں ہلکی سی سرسراہٹ سنائی دی، جیسے کوئی ہوا میں اپنے پر پھیلا رہا ہو۔ ایک نئی شبیہ ابھری — یہ ایک متحرک، چمکدار وجود تھا، جو کبھی بڑا اور کبھی چھوٹا ہو جاتا، کبھی روشنی کی کرن میں تبدیل ہو جاتا اور کبھی سائے میں گم ہو جاتا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ تھی، اور آنکھوں میں شعلے کی سی چمک۔

"میں تغیر کا پیامبر ہوں"! اس نے پرجوش لہجے میں کہا۔ "یہ مخلوق کسی چھپے ہوئے لاشعور کی قیدی نہیں، اور نہ ہی کسی بچپن کے گھٹن زدہ زخموں کی غلام! اس کے اعمال کے محرکات کا راز اس کے باہر کی دنیا میں چھپا ہے۔ یہ اس کا ماحول ہے جو اسے تشکیل دیتا ہے، یہ خارجی عناصر ہیں جو اس کے خیالات، رویے اور جذبات کو تراشتے ہیں۔ اسے سمجھنا ہے، تو اس کے اردگرد پھیلے محرکات کو سمجھو"!

وہ خلا میں جھکا، جیسے زمین سے کچھ اٹھا رہا ہو۔ "یہ پتھر دیکھو"! اس نے ایک بے جان پتھر اٹھایا اور بلند کیا۔ "اگر میں اسے پانی میں پھینک دوں، تو لہریں پیدا ہوں گی۔ اگر میں اسے کسی پر پھینک دوں، تو ردعمل ہوگا۔ اسی طرح، یہ مخلوق بھی اپنے ماحول کی پیداوار ہے۔ اس پر اثر ڈالو، یہ بدل جائے گی۔ اسے کسی نئے سانچے میں ڈھالو، یہ نئے طرز پر جینے لگے گی۔ یہ دنیا ایک تجربہ گاہ ہے، اور یہ مخلوق محض ایک تجرباتی وجود"!

یہ کہتے ہی باقی ہیولوں میں ہلچل مچ گئی۔ ایک اور شبیہ آگے بڑھی، جس کے چہرے پر سنجیدگی اور آواز میں گہرائی تھی۔

"تمہارا کہنا ہے کہ یہ مخلوق صرف خارجی عوامل کے تابع ہے؟" اس نے ایک بھاری سانس لی۔ "تو کیا اس کے اندر کوئی ذاتی فیصلہ سازی کی قوت نہیں؟ کیا یہ محض ایک کٹھ پتلی ہے جو اپنے اردگرد کے حالات کے مطابق حرکت کرتی ہے؟ اگر ایسا ہوتا، تو یہ سب ایک جیسے ہوتے۔ مگر نہیں! ہر ایک میں کچھ نہ کچھ منفرد ہے، کچھ ایسا جو محض خارجی دنیا کے اثر سے نہیں بنا۔ تمہارا نظریہ ادھورا ہے، میرے دوست"!

تغیر کے پیامبر نے مسکراتے ہوئے سر جھکایا، جیسے کہہ رہا ہو: "وقت ہی فیصلہ کرے گا"!

دوسرے دھند لکے کی مسکراہٹ ابھی مدھم بھی نہ ہوئی تھی کہ خلا میں ایک ٹھوس ارتعاش پیدا ہوا۔ جیسے کسی نے بے آواز طبل بجا دیا ہو۔ ایک اور وجود آگے بڑھا، مگر یہ پہلے دونوں سے مختلف تھا — اس کا جسم متوازن، حرکات شائستہ اور آنکھیں کسی خاموش سمندر کی طرح پرسکون تھیں۔ اس کے چہرے پر نہ کوئی بے قراری تھی، نہ ہی بے یقینی۔ ہر چیز کا ایک

تناسب تھا، جیسے اس نے ہر شے کو جانچ کر، تول کر، ناپ کر ترتیب دیا ہو۔

"میں نظم و توازن کا پیامبر ہوں"! اس نے دھیمے مگر پُر اثر لہجے میں کہا۔ "یہ مخلوق کسی لاشعوری قوت کی اسیر نہیں، نہ ہی یہ محض خارجی عوامل کی پیداوار ہے۔ یہ اپنی عقل سے کام لیتی ہے، اور اسی عقل کے ذریعے خود کو سمجھتی ہے۔"

وہ آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے بولا، "ہر شے کا ایک اصول ہوتا ہے۔ سیارے اپنے مدار میں گھومتے ہیں، درخت اپنی جڑوں میں غذا کھینچتے ہیں، روشنی ہمیشہ ایک خاص زاویے پر منعکس ہوتی ہے۔ اسی طرح یہ مخلوق بھی کچھ اصولوں کے مطابق عمل کرتی ہے۔ اگر اس کے ذہن میں تضاد پیدا ہو، تو یہ اسے سلجھانے کی کوشش کرتی ہے۔ اگر اسے کوئی ایسی بات ملے جو اس کے اصولوں سے متصادم ہو، تو یہ یا تو اسے مسترد کر دے گی یا خود کو اس کے مطابق ڈھال لے گی۔ مگر اس کے ہر عمل کے پیچھے ایک عقلی منطق ہے، ایک ترتیب، ایک منہج"!

اس نے ایک قدم آگے بڑھایا اور باقیوں کی طرف دیکھا، "یہ مخلوق تجربے سے سیکھتی ہے، سوال کرتی ہے، تجزیہ کرتی ہے اور اپنے نظریات کو عقل کی کسوٹی پر پرکھتی ہے۔ میں اس کی عقل کا نمائندہ ہوں، اور میں کہتا ہوں کہ اسے سمجھنے کے لیے ہمیں اس کی فکری و منطقی ساخت کو سمجھنا ہوگا"!

ابھی اس کے الفاظ کی بازگشت ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ ایک آواز ابھری، جیسے کہیں دور گہرے پانیوں میں کوئی پتھر پھینکا گیا ہو۔ ایک اور ہستی نے مسکراتے ہوئے سر جھکایا، "تو تم کہتے ہو کہ یہ محض عقل کی دنیا میں قید ہے؟ کیا یہ جذبات سے عاری ہے؟ کیا یہ صرف منطقی کسوٹی پر ہی ہر شے کو پرکھتی ہے؟ مگر میں کہتا ہوں، یہ مخلوق ایک اور حقیقت کی پابند ہے — ایک ایسی حقیقت جسے تم نظر انداز کر رہے ہو"!

اس کی بات ابھی مکمل بھی نہ ہوئی تھی کہ خلا میں ایک مدھم سرگوشی گونجی، جیسے کسی پوشیدہ ساز کے تار لرز رہے ہوں۔ دھیرے دھیرے ایک اور ہستی ابھری — مگر یہ باقیوں سے بالکل مختلف تھی۔ نہ اس کے چہرے پر استدلال کی سنجیدگی تھی، نہ ہی خارجی عوامل کی پیچیدگی، نہ کسی لاشعور کی دھند میں لپٹی حقیقت۔ اس کے چہرے پر ایک عجیب روشنی تھی، جیسے کوئی سلگتی ہوئی آگ ہو، مگر اس کے بدن کی حرکات نرم تھیں، جیسے ہوا میں بکھرتے بادل۔

"میں احساسات اور تجربات کا پیامبر ہوں"! اس نے دھیمے مگر گہرے لہجے میں کہا۔ "تم سب اسے عقل، لاشعور، یا خارجی عوامل سے جانچ رہے ہو، مگر میں کہتا ہوں کہ یہ مخلوق سب سے پہلے ایک محسوس کرنے والا وجود ہے! اس کا ہر عمل، ہر فیصلہ، ہر سوچ کسی نہ کسی جذبے کا نتیجہ ہے۔ یہ ہنستی ہے، روتی ہے، محبت کرتی ہے، نفرت کرتی ہے، خواب

دیکھتی ہے، مایوس ہوتی ہے، امید باندھتی ہے۔اگر تم اسے سمجھنا چاہتے ہو، تو تمہیں اس کے احساسات کے دریچے میں جھانکنا ہوگا"!

اس نے اپنا ہاتھ بلند کیا، اور فضا میں رنگ بکھرنے لگے — شدید سرخ، نرم نیلا، زرد دھوپ کی مانند، سبز ہریالی کی طرح۔ "یہ رنگ دیکھ رہے ہو؟ یہ محض روشنی کے زاویے نہیں، یہ جذبات کی شکلیں ہیں! جب یہ مخلوق خوش ہوتی ہے، تو اس کے اردگرد سب کچھ چمکنے لگتا ہے، جب یہ افسردہ ہوتی ہے، تو دنیا دھندلی ہو جاتی ہے۔اس کی زندگی ایک مسلسل جذباتی تجربہ ہے، اور اس تجربے کی شدت ہی اس کے ہونے کا اصل سبب ہے۔"

یہ کہتے ہی ایک اور سایہ ہلکی ہنسی کے ساتھ آگے بڑھا، اس کی آنکھوں میں ایک گہری چمک تھی، جیسے کسی بھید کا رازدار ہو۔ "تم کہتے ہو کہ یہ مخلوق جذبات میں جیتی ہے؟ تو کیا یہ کسی منطق یا کسی سماجی بندھن سے آزاد ہے؟ کیا یہ صرف ایک بہتا ہوا دریا ہے، جو کسی سمت کا پابند نہیں؟ مگر میں کہتا ہوں، اس مخلوق کو سمجھنے کے لیے، جذبات سے آگے بڑھنا ہوگا۔"

اس کی بات ابھی ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ خلا میں ایک گونج ابھری، جیسے کسی قدیم ساز کے تار بج اٹھے ہوں۔ایک اور ہستی دھیرے دھیرے آگے بڑھی۔مگر یہ کسی روشن شعلے کی طرح متحرک نہیں تھی، نہ ہی اس کے وجود میں پانی کی سی لچک تھی۔ یہ جیسے کسی قدیم درخت کی طرح ایستادہ تھی، جس کی جڑیں زمین کی گہرائیوں میں پیوست تھیں۔اس کی آنکھوں میں سکون تھا، مگر ساتھ ہی ایک ٹھہرا ہوا وقار بھی۔

"تم سب اسے فرد کی حیثیت سے دیکھ رہے ہو"! اس نے بھاری اور گونجدار آواز میں کہا۔" کبھی اس کے اندر کے نہاں خانوں میں، کبھی اس کی عقل میں، کبھی اس کے جذبات میں! مگر میں کہتا ہوں کہ یہ مخلوق ایک تنہا وجود نہیں، یہ ہمیشہ ایک بڑے سماجی دھارے کا حصہ ہوتی ہے۔ یہ کسی نہ کسی گروہ سے وابستہ ہے، کوئی قبیلہ، کوئی معاشرہ، کوئی قوم، کوئی نظریہ! اگر تم اسے سمجھنا چاہتے ہو، تو اسے اکیلے مت دیکھو۔اسے اس کے لوگوں کے ساتھ دیکھو، اس کی ثقافت کے ساتھ، اس کی روایات اور تعلقات کے ساتھ"!

اس نے خلا میں ہاتھ پھیرا، اور بے شمار دھاگے نمودار ہوئے، جو دور کہیں جا کر دوسرے دھاگوں سے جڑ رہے تھے۔ "یہ دھاگے دیکھ رہے ہو؟ یہ اس مخلوق کے تعلقات ہیں، جو اسے ایک فرد سے بڑھا کر ایک اجتماعی اکائی میں ڈھال دیتے ہیں۔اس کا ہر خیال، ہر احساس، ہر فیصلہ انھی دھاگوں سے جڑا ہوا ہے۔ یہ اپنے رسم و رواج، اپنی اقدار، اپنے مذہب، اپنی زبان کے بغیر کچھ بھی نہیں! اس کی شخصیت کو سمجھنا چاہتے ہو، تو اس کے معاشرے کو سمجھو"!

ابھی اس کی بات ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ ایک اور ہنسی گونجی۔ **مگر** یہ ہنسی ٹھہری ہوئی نہیں تھی، بلکہ کسی بگولے کی طرح گردش کر رہی تھی۔ **ایک** نئی ہستی آگے بڑھی، اس کی چال میں آزادی تھی، اس کی آنکھوں میں وحشت۔ "تم اسے صرف **ایک** سماجی مخلوق سمجھ رہے ہو؟" اس نے مسکراتے ہوئے کہا، "تو پھر اس کی بغاوت کا کیا کرو گے؟"

پھر اچانک خلا میں **ایک** زوردار ارتعاش پیدا ہوا، جیسے کوئی زنجیر ٹوٹ گئی ہو، جیسے کسی پنجرے کا دروازہ کھل گیا ہو۔ **ایک** اور ہستی آگے بڑھی۔ **مگر** اس کی چال میں ٹھہراؤ نہ تھا، بلکہ **ایک** بے قابو توانائی تھی، جیسے ہوا کے دوش پر اڑنے والا شعلہ۔ اس کی آنکھوں میں **ایک** عجیب سی چمک تھی، نہ مستقل مزاجی کی روشنی، نہ جذبات کی تپش، بلکہ **ایک** بے قرار چمک، جیسے کوئی بندھن توڑ کر بھاگنے والا جانور۔

"تم سب اسے کسی نہ کسی قید میں دیکھ رہے ہو"! اس نے طنزیہ ہنسی کے ساتھ کہا۔ " کوئی اسے نہاں خانوں کا غلام سمجھتا ہے، کوئی عقل کا، کوئی جذبات کا، کوئی سماج کا۔ **مگر** میں کہتا ہوں کہ یہ مخلوق سب سے پہلے **ایک** آزاد ہستی ہے! یہ کسی اصول، کسی روایات، کسی رشتے، کسی قید کی پابند نہیں۔ یہ بغاوت کرنا جانتی ہے، یہ اپنے راستے خود بناتی ہے، یہ سوال کرتی ہے، روایات کو چیلنج کرتی ہے، پرانی زنجیریں توڑ کر نئی راہیں تلاش کرتی ہے"!

اس نے خلا میں ہاتھ پھیرا، اور دھاگے جو پچھلے **نظریے** نے دکھائے تھے، جھٹکے سے ٹوٹنے لگے۔ "یہ دیکھو! تم نے کہا تھا کہ یہ رشتوں میں جکڑی ہوئی ہے، **مگر** میں کہتا ہوں کہ یہ انہی رشتوں کو کاٹنے کی طاقت بھی رکھتی ہے! اگر تم اسے سمجھنا چاہتے ہو، تو اس کی بغاوت کو سمجھو، اس کی جدوجہد کو دیکھو، اس کے اندر کے طوفان کو محسوس کرو۔"

ایک لمحے کے لیے خلا میں خاموشی چھا گئی۔ پھر **ایک** مدھم **مگر** پُراعتماد آواز ابھری۔ "تم کہتے ہو کہ یہ بغاوت کرتی ہے، **مگر** کیا یہ کبھی مکمل آزاد ہو سکتی ہے؟ کیا یہ اپنے جسم، اپنے وقت، اپنی تقدیر سے بچ سکتی ہے؟"

اس کی بے قراری ابھی مکمل طور پر تحلیل بھی نہ ہوئی تھی کہ خلا میں **ایک** دبیز، گمبھیر سناٹا چھا گیا۔ جیسے کوئی گہرا کنواں ہو، جس کی تہہ میں کوئی صدیوں سے خاموش بیٹھا ہو۔ پھر دھیرے دھیرے، سائے میں لپٹی **ایک** ہستی ابھری۔ اس کا وجود دھواں دھواں سا تھا، جیسے کسی پرانی یاد کی گونج، جیسے کوئی خواب جو مکمل نہ ہو پایا ہو۔ اس کے چہرے پر سکون نہ تھا، اضطراب نہ تھا۔ بس **ایک** نامعلوم سا بوجھ تھا، جیسے وقت کا وزن اس کے وجود پر دھرا ہو۔

"تم سب نے اسے کسی نہ کسی قوت سے منسلک کیا۔ عقل، جذبات، لاشعور، سماج، بغاوت۔ **مگر** میں کہتا ہوں، یہ مخلوق سب سے پہلے اپنی ہی فانی حقیقت کی قیدی ہے۔" اس کی آواز بوجھل تھی، جیسے کوئی سرگوشی جو کانوں میں گونج کر بھی

پوری طرح سنی نہ جا سکے۔" یہ جتنی بھی بغاوت کر لے، جتنی بھی عقل لڑا لے، جتنے بھی جذبات محسوس کر لے، آخر کار اسے فنا ہونا ہے۔ یہ ایک محدود وقت کے لیے زندہ ہے، اور اس کا سب سے بڑا سوال یہی ہے — یہ کب ختم ہو گی؟ کیوں ختم ہو گی؟ اور ختم ہونے کے بعد کیا ہو گا؟"

اس نے اپنا ہاتھ خلا میں اٹھایا، اور وہاں ایک ساعت نما نمودار ہوئی — مگر اس کی سوئیاں تیزی سے گردش کر رہی تھیں، جیسے وقت بے قابو ہو، جیسے کوئی کسی چیز کو روکنے کی کوشش کر رہا ہو، مگر روک نہ پا رہا ہو۔

"یہ تمام خیالات، یہ تمام نظریے، یہ تمام دعوے — سب اسی حقیقت کے گرد گھومتے ہیں کہ یہ مخلوق جانتی ہے، اسے ایک دن ختم ہو جانا ہے۔ اس کی عقل، اس کے خواب، اس کے رشتے، اس کی محبتیں — یہ سب ایک دن تحلیل ہو جائیں گے۔ اور یہی خوف، یہی آ گہی، یہی بے بسی اس کے تمام فیصلوں کے پیچھے ہے۔ اگر تم اسے سمجھنا چاہتے ہو، تو اس کے وقت کے خلاف چلنے والے قدموں کو دیکھو، اس کے لمحوں کی جنگ کو سمجھو، اس کی فنا کے خلاف مزاحمت کو جانو۔"

ایک سناٹا چھا گیا۔ باقی تمام نظریے اس کی بات پر غور کرنے لگے۔ مگر پھر ایک اور روشنی ابھری — یہ روشنی مختلف تھی، جیسے کسی بے حد وسیع افق سے آ رہی ہو، جیسے کوئی عظیم چیز قریب آ رہی ہو۔

وقت کی بے رحم گردش کا ذکر ابھی مکمل نہ ہوا تھا کہ خلا میں ایک اور کیفیت نے جنم لیا — یہ روشنی نہ تھی، نہ اندھیرا، بلکہ جیسے کوئی قدیم نغمہ، جو سنائی تو نہ دے، مگر اس کی سرگوشیاں فضا میں تحلیل ہو رہی ہوں۔ اچانک، ایک نئی ہستی نمودار ہوئی، مگر اس کی صورت کو کوئی مکمل طور پر بیان نہ کر سکتا تھا۔ یہ کبھی ایک شعلہ لگتی، کبھی ہوا کا جھونکا، کبھی ایک معصوم سا سایہ، کبھی کوئی نا قابلِ گرفت روشنی۔

"تم سب نے اسے کسی نہ کسی زنجیر میں جکڑنے کی کوشش کی،" اس نے دھیرے سے کہا۔ "عقل، جذبات، لاشعور، سماج، بغاوت، وقت! مگر میں کہتی ہوں، یہ مخلوق کسی ایک حقیقت میں مقید نہیں۔ یہ وہ ہستی ہے جو ایک لمحے میں خوش ہوتی ہے، دوسرے میں غمزدہ۔ یہ کبھی بہادر ہوتی ہے، کبھی خوفزدہ۔ کبھی عاشق، کبھی دشمن۔ کبھی باغی، کبھی غلام۔ یہ ایک معمہ ہے، ایک تضاد ہے، ایک گتھی ہے جو کسی ایک اصول سے نہیں سلجھ سکتی۔"

اس نے خلا میں ہاتھ پھیلایا، اور وہاں رنگوں کی ایک قوس قزح نمودار ہوئی — مگر اس کا ہر رنگ مسلسل بدل رہا تھا، جیسے کوئی تصویر ہو جو ایک لمحے میں مکمل ہو، اور دوسرے ہی لمحے تحلیل ہو جائے۔

"تم اسے ایک اصول میں باندھنے کی کوشش کر رہے ہو، مگر یہ ایک بہاؤ ہے، ایک تسلسل ہے، ایک لمحے سے دوسرے

لمحے میں بدلتی حقیقت۔ اگر تم اسے سمجھنا چاہتے ہو، تو اسے کسی ایک نکتے میں قید مت کرو، بلکہ اس کے مسلسل تغیر کو جانو۔ یہ جامد نہیں، یہ ایک سفر ہے، ایک ایسی لہر جو کبھی رُکتی نہیں۔"

ایک سنّاٹا چھا گیا۔ باقی تمام نظریے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ ان کے چہروں پر سوال تھے، شک تھا، ایک انجانی بے یقینی تھی۔ آخرکار، وہ سب ایک ساتھ بولے:

"اگر یہ کوئی ایک حقیقت نہیں، تو پھر اسے کیسے سمجھا جا سکتا ہے؟ اگر یہ مسلسل بدلتی رہتی ہے، تو پھر علم، تحقیق اور تجربہ کس کام کے؟ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ اسے جاننا ممکن نہیں؟"

ہستی نے ایک پراسرار مسکراہٹ کے ساتھ خلا میں نظریں دوڑائیں۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی، وہ ہستی، جو تمام بحث کو خاموشی سے سن رہی تھی، اچانک اٹھ کھڑی ہوئی—

وہی مخلوق جسے تمام روشنیاں سمجھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

تمام ہیولے حیرت سے اس مخلوق کو دیکھ رہے تھے، جواب تک خاموشی سے بحث سن رہی تھی۔ اس کی حرکات میں ایک عجیب سا سکون تھا، جیسے کوئی ایسا راز جانتا ہو جسے دوسرے نہیں سمجھ سکتے۔

" آخرکار، تم نے فیصلہ کر لیا؟" ایک سایہ بولا۔

مخلوق نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھی، اور خلا میں ہاتھ پھیلایا۔ وہاں، اچانک، شفاف شیشے کے مرتبان نمودار ہونے لگے، ہر ایک کا دہانہ کھلا تھا، جیسے کسی نامعلوم چیز کو سمیٹنے کے لیے تیار ہوں۔

ہیولے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ "یہ کیا کر رہا ہے؟"

پھر، حیرت انگیز طور پر، مخلوق نے ایک ایک کر کے سائیوں کو اٹھانا شروع کیا۔ پہلے ایک، پھر دوسرا، پھر تیسرا—ہر ہیولہ، جو ابھی تک بلند آواز میں دعوے کر رہا تھا، اچانک خاموش ہونے لگا۔ وہ ہستی انہیں شیشے کے مرتبانوں میں بند کرتی گئی، اور دھیرے سے ان کے ڈھکن لگا دیے۔

"یہ کیا کر رہا ہے؟" ایک سایہ چلایا، مگر جیسے ہی وہ مرتبان میں قید ہوا، اس کی آواز دب گئی۔

جب سب روشنیاں بند ہو چکیں تو مخلوق نے رسی اٹھائی اور ان مرتبانوں کو خلا میں معلق کر دیا، جہاں وہ ایک قطار میں جھولنے لگے۔ ہر مرتبان میں روشنی کی ایک مدھم سی لہر موجود تھی، جیسے وہ ہیولے اب بھی زندہ ہوں، مگر اب بولنے کے قابل نہ رہے ہوں۔

پھر، مخلوق نے **ایک** لمحے کے لیے ان شیشے کے قید خانوں کو دیکھا— **ایک** ایسی **نظر** سے، جو نہ **فخر** کی تھی، نہ **نفرت** کی، نہ رحم کی، نہ تسکین کی۔ بلکہ **ایک** ایسی **نظر** جو شاید کسی **انجانی** سچائی کو جان چکی ہو، **مگر** اسے بیان کرنے کی ضرورت نہ سمجھی ہو۔

نعمت

کہتے ہیں، جنگل کے سینے میں ایک خاموش وادی بسی ہوئی تھی — ایسی وادی، جہاں ہوا بھی آہستہ چلتی تھی کہ کہیں سکوتِ فطرت کا تقدس پامال نہ ہو جائے۔ پہاڑوں کے سینے میں گُھسی ہوئی یہ وادی، گویا قدرت کے دستِ خفیہ کی آغوش میں چھپی ہوئی کوئی راز کی مانند تھی۔ دن کے اوقات میں سورج کی زرد کرنیں درختوں کے پتوں پر اس طرح چھنتی تھیں جیسے کسی قدیم مصور نے طلاء کاری کے ساتھ زندگی کا کوئی خواب بُن دیا ہو، اور راتوں کو چاندنی پتھریلی ڈھلوانوں پر اس طرح بکھرتی جیسے کسی شاعر نے سفید موتیوں کا اشعار میں ترجمہ کیا ہو۔

اسی وادی میں، پُراسرار حسن کی اس گود میں، ایک بارہ سنگھا رہتا تھا — ایسا بارہ سنگھا جس کے سینگ آسمان کی سمت اس طرح بلند تھے جیسے سوال کرنے کی جرات خود فطرت سے ورثے میں ملی ہو۔ اس کی آنکھوں میں کوئی پرانا دکھ نہیں تھا، اور قدموں میں کوئی بندھن بھی نہ تھا — مگر اس کے اردگرد ایک خاموش وحشت چھپی ہوتی تھی، جیسے دل میں کوئی نہ کہا گیا راز دبا ہو۔

بارہ سنگھے کا جسم نحیف نہ تھا، لیکن وادی کی کم خوراکی نے اس کے بدن پر گویا صوفیانہ قناعت کا لبادہ ڈال دیا تھا۔ اس کی کھال پر غروبِ آفتاب کی دھندلی روشنی پڑتی تو وہ کسی خاکستری چادر کی مانند لگتا — شفاف اور پر جمال۔

وادی میں رہنے والے کتّے، جو ایک باقاعدہ غول کی شکل میں بستے تھے، اس بارہ سنگھے کے ہمسایہ تھے۔ ان میں کوئی خاص خوبصورتی نہ تھی، مگر ان کی چالوں میں نظم، آنکھوں میں چالاکی، اور بھونک میں ایک اجتماعی دعویٰ محسوس ہوتا تھا۔ وہ شکار پر نکلتے، پہرے دیتے، اور گویا جنگل کی نگران قوتوں میں شمار ہوتے۔

اگرچہ یہ کتّے بارہ سنگھے کے ہم نسل نہ تھے، مگر دونوں کے بیچ ایک غیر تحریری معاہدہ تھا—امن کا، ہمسائیگی کا، اور کبھی کبھی نرمی و محبت کا۔ وہ بارہ سنگھے کے گرد گھومتے تھے، کبھی اس کے قدموں کے پاس لیٹ جاتے اور کبھی اس کے ساتھ خاموشی سے وادی کی کسی کونے تک چلے جاتے۔ بارہ سنگھے کی موجودگی ان کے لیے غیر معمولی نہ سہی، لیکن ناپسندیدہ بھی نہ تھی — بلکہ وہ اسے ایک دانا اور نرم دل مخلوق سمجھتے تھے، شاید اس لیے کہ وہ تنہا رہتا تھا، اور تنہائی اکثر دانائی کے خمیر میں گھلی ہوتی ہے۔

وادی کے اُس پار، گہری دراڑ تھی — زمین کا وہ زخم، جو دو وادیوں کو جدا کرتا تھا۔ دراڑ کے اُس پار ایک اور وادی تھی، جس کی سبزہ زاریوں کے قصے ہواؤں میں تیرتے تھے، جیسے کوئی متروک خواب، جو تعبیر سے محروم رہا ہو۔ بارہ سنگھا اکثر اس دراڑ کے کنارے آ کھڑا ہوتا، نگاہ اُس وادی پر، دل میں ایک خاموش خواہش لیے — مگر قدم ہمیشہ پیچھے ہٹ جاتے، جیسے خوف کی زنجیر اسے واپس کھینچ لیتی ہو۔

وقت ایک نادیدہ جھرنا ہے، جو وادی کی یادوں میں چپ چاپ بہتا رہتا ہے۔ اسی وقت کے دھارے میں بارہ سنگھے اور کتّوں کے درمیان ایک رشتہ نمو پاتا رہا — خاموش، مگر معنٰی خیز۔ اگرچہ زبان کا اشتراک نہ تھا، مگر جذبوں کی وہ لغت، جو فطرت نے قلبِ حیوان میں رکھ چھوڑی ہے، ان کے درمیان تفہیم کا پل بن گئی تھی۔

ایک صبح جب کہ دھند نے درختوں کو سفید کفن اوڑھا رکھا تھا، ایک کتّیا کی آہ و زاری بارہ سنگھے کے گوش میں پڑی۔ وہ لپکتا ہوا اُس جھاڑی تک پہنچا جہاں ننھے سے دو بچے کانپتے ہوئے، خاردار ٹہنیوں میں الجھے پڑے تھے۔ بارہ سنگھے نے اپنی بلند گردن کو آہستگی سے نیچے جھکایا، اپنے سینگوں سے ایک جانب شاخیں ہٹائیں، اور اپنے سموں سے مٹی کو نرمی سے کرید کر جھاڑی کی جڑوں کو ڈھیلا کیا۔ پل بھر میں وہ ننھے وجود رہائی پا کر اپنی ماں کے پہلو میں دبک گئے۔ کتّیا نے خاموشی سے اپنی دم ہلائی، جیسے فطرت کی زبان میں شکریہ ادا کیا ہو۔

ایک اور موقع پر، جب ایک بوڑھا کتّا زخمی ٹانگ کے ساتھ شکار سے لوٹا، بارہ سنگھے نے اسے اپنی پشت پر سوار کیا اور وادی کے اُس گوشے تک پہنچایا جہاں نیم گرم چٹانیں جسم کو راحت دیتی تھیں۔ وہیں بیٹھ کر بارہ سنگھا اس کے زخم چاٹتا رہا — گویا خود پر مرہم رکھ رہا ہو۔

بارہا ایسا ہوا کہ سردیوں کی طویل راتوں میں بارہ سنگھا اپنے جسم کی حرارت کُتّوں کے ننھے بچوں میں بانٹتا رہا۔ وہ سب مل کر ایک دائرے کی صورت میں سو جاتے، اور بارہ سنگھا اس دائرے کا مرکز بنتا— جیسے وقت کے پہیے کی نبض اسی کی

موجودگی سے دھڑکتی ہو۔

اس باہمی تعلق میں **ایک** خاموش رضا کارانہ قربانی کی خوشبو رچی ہوئی تھی۔ کُتّے اسے **"بوڑھا دانا"** کہا کرتے — حالانکہ وہ نہ تو بوڑھا تھا اور نہ ہی کسی قبیلے کا بزرگ — مگر دانائی کی مہک عمر سے نہیں، تجربے اور خامشی سے پیدا ہوتی ہے۔ وہ کُتّوں کو پانی کی نشاندہی کرتا، سوکھی گھاس میں چھپی زہریلی جڑوں سے آگاہ کرتا، اور کئی بار شیر یا بھیڑیے کی موجودگی کی آہٹ سن کر غول کو خبردار کرتا۔

کتّے بھی اس رفاقت کے مقروض تھے۔ وہ اس کی رکھوالی کرتے، شکار میں گوشت کا چھوٹا حصہ اس کے قریب رکھ دیتے، اور اگر کوئی اجنبی جانور وادی میں قدم رکھتا، تو سب سے پہلے اس کی راہ میں کھڑے ہو کر بارہ سنگھے کو خبر دیتے۔

یوں لگتا تھا جیسے وادی میں یہ تعلق خود فطرت کا تانا بانا ہو — **ایک** ایسا جال جس میں نہ حاکم تھا، نہ محکوم — صرف ربط تھا، اور ربط ہی سب سے بڑی حکمرانی ہے۔

وادی کی ہوا میں اُس روز کوئی بے چینی گھلی ہوئی تھی۔ بادل نیچے جھک آئے تھے، جیسے زمین کی آہوں کو سننے آئے ہوں۔ بارہ سنگھا، حسبِ معمول، گھاس کی تلاش میں وادی کے شمالی کنارے تک گیا، جہاں کچھ جھاڑیاں خشک سہی، **مگر** غذا کے لیے قابلِ قبول تھیں۔ وہ اپنے نازک **مگر** مضبوط سموں سے **ایک** جھاڑی کو ہٹانے لگا کہ اچانک **ایک** نحیف چیخ اس کے کانوں میں پڑی۔

جھاڑی کے نیچے **ایک** نومولود پِلّا دبا ہوا تھا — شاید بارہ سنگھے کی حرکت سے وہ زخمی ہوا تھا، یا پہلے سے کمزور تھا۔ اس کے وجود سے خون کی پتلی لکیر نکل کر مٹی میں جذب ہو رہی تھی، جیسے زمین خاموشی سے درد نوش کر رہی ہو۔

چند لمحوں میں غول کے چند کتّے وہاں جمع ہو گئے۔ ان کی آنکھوں میں شناسائی کی جگہ شک، اور اعتماد کی جگہ غیظ و غضب تھا۔ ان میں سب سے آگے کالا بھورا کُتّا تھا، جس کے جسم پر پرانی لڑائیوں کے زخموں کے نشان تھے — وہ ہر چیز کو دشمنی کی عینک سے دیکھتا تھا۔ اس کے برابر میں دُھندلا سفید کُتّا کھڑا تھا، جس کی آواز نرم **مگر** زہر سے لبریز تھی؛ وہ ہمیشہ شک و شبہے کا بیج بوتا تھا۔

تیسرے کتّے کا نام چُھریا تھا، جو نہایت تیز رفتار اور بلا کا چالاک تھا۔ چوتھا، گونگا، نام کا ہی گونگا تھا **مگر** بھونکنے میں سب پر سبقت لے جاتا۔ اور پانچواں، لالا، **ایک** سرخ مائل آنکھوں والا خونخوار کتّا، جو ہمیشہ لڑنے کے بہانے ڈھونڈتا تھا۔

"یہ بارہ سنگھا وفادار نہیں رہا"! — کالا بھورا بھونکا۔

"یہ ہماری نسلوں کے قاتل ہیں"!— سفید کُتّے نے زہر اگلا۔

"یہ خاموشی سے دشمنی کرتا رہا ہے"!— چھریا نے ہوا میں قوس بنائی۔

اور پھر جیسے صدیوں کی بیزاری پھٹ پڑی ہو، سب نے ایک ساتھ اُس پر جھپٹنے کا ارادہ باندھا۔ بارہ سنگھے کے قدم چند لمحے کے لیے ساکت ہوئے، دل کی دھڑکن نے وقت کی رفتار کو چیر کر سنّاٹے میں گونج پیدا کی۔ وہ بھاگا— زندگی کی طرح، خوف کی مانند۔

جنگل کی راہیں تنگ تھیں، مگر بارہ سنگھا بچپن سے اُن کا عادی تھا۔ ہر چھلانگ، ہر موڑ، جیسے کوئی نظم پڑھی جا رہی ہو۔ مگر پیچھے بھونکتے کُتّے اُس نظم میں فساد کی صورت داخل ہو چکے تھے۔ وہ قریب آتے جا رہے تھے، زمین پر ان کے قدموں کی دھمک اس کے دل کی دھڑکن میں گھُل گئی تھی۔

کبھی بارہ سنگھا پیچھے مڑ کر دیکھتا تو آنکھوں میں آگ سی لپکتی محسوس ہوتی۔ ایک کانٹے دار جھاڑی اس کے پہلو سے چھو گئی، خون کی ایک بوند نکلی— مگر اس کے قدم نہ رکے۔ وہ ایک چٹان سے دوسرے پتھر پر چھلانگیں مارتا، خود کو ہواؤں کے حوالے کرتا جا رہا تھا۔

اچانک، وہ اُس دراڑ کے کنارے آن پہنچا، جس کے اُس پار ہمیشہ کی سبز وادی تھی— مگر درمیان میں وہ گہری، خاموش خلیج۔

پیچھے بھونکوں کا طوفان، آگے ایک ناگزیر فیصلہ۔ وہ لمحہ، جس میں انسان یا حیوان، اپنے باطن سے فیصلہ کرتا ہے— یا تو فنا، یا چھلانگ۔

زندگی بعض اوقات ایسے موڑ پر لے آتی ہے جہاں پیچھے زخم اور آگ ہوتی ہے، اور آگے ایک نامعلوم خلا— درمیان میں فقط ایک فیصلہ۔ بارہ سنگھے کی نگاہ دراڑ کے پار ٹھہر گئی، جہاں ہریالی پکارتی تھی، جہاں ہوا میں محبت کی بو تھی، اور جہاں پیاسے خواب سبز زمین پر لیٹے سستا رہے تھے۔

پیچھے غصّے، بے حسی اور ندامت سے عاری وہ پنجے تھے، جن کے نیچے وفا روند دی گئی تھی۔ کتّوں کی بھونکار اب خالی غاروں میں گونج بن چکی تھی، اور وہ خود ایک گونج کے تعاقب میں سرگرداں تھے۔

بارہ سنگھا، جس کے بدن پر کُتّوں کے تعاقب کی دھول جمی تھی، سینے میں طعنوں کا زہر، اور آنکھوں میں اجنبیت کے کانٹے چبھ رہے تھے، ایک لمحے کے لیے رکا— صرف ایک لمحے کے لیے۔ پھر اس کی آنکھوں نے کسی اندرونی روشنی کو

چمکتے دیکھا۔ وہ روشنی کسی صبح کی نہیں تھی، بلکہ اپنے وجود کی دریافت کی کرن تھی۔

اُس نے چھلانگ لگائی۔

نہ وہ چھلانگ فقط جسم کی تھی، نہ فقط زمین کی۔ وہ چھلانگ بزدلی سے حوصلے کی طرف، تردد سے یقین کی جانب، اور ماضی کی بیڑیوں سے آزاد مستقبل کی دہلیز تک تھی۔

ہوا نے اُسے تھاما نہیں، مگر اُس نے خود کو تھام لیا۔ لمحہ بھر کو وہ خلا میں معلق رہا، جیسے وقت خود سانس روک کر اُسے دیکھ رہا ہو۔ پھر زمین نے اُسے اپنے نرم بستر پر سلا دیا — وہ دوسری طرف تھا۔

سامنے ہری بھری وادی اپنے سبز آغوش میں پھیلی ہوئی تھی۔ ہر طرف گاس کی قطاریں ایسے تھیں جیسے کسی قدیم رزمیہ نظم کے اشعار، جنہیں صرف وہی پڑھ سکتا ہے جو دکھ جھیل کر آیا ہو۔ درختوں کی شاخیں گیت گاتی تھیں، اور ہوا جیسے پہلی بار اُس کے وجود سے آشنا ہوئی تھی۔

بارہ سنگھے نے ایک لمحہ آنکھیں بند کر کے ہوا کی تازگی کو محسوس کیا۔ کتّوں کی آواز اب ماضی کی ایک دُھند تھی، جواب نہ زخم دیتی تھی، نہ خوف۔ بلکہ اب وہ آوازیں اُسے اُس قوت کی یاد دلاتی تھیں جو اس کے اندر چھپی ہوئی تھی، مگر ضرورت کے بغیر کبھی بیدار نہ ہو پائی تھی۔

پھر اُس نے گردن بلند کی، جیسے فطرت کے حضور سجدہ شکر ادا کر رہا ہو۔

اس کا سینگ سورج کی روشنی میں چمک رہا تھا، جیسے وہ اب صرف بارہ سنگھا نہ رہا ہو، بلکہ وہ علامت بن چکا ہو — ان سب کے لیے جو دشمنی کو رہنما، زخم کو بیداری، اور زہر کو شفا میں بدلنے کا ہنر رکھتے ہیں۔

اسے خبر ہو چکی تھی کہ بعض اوقات دشمنی کا پتھر وہ سیڑھی بن جاتا ہے، جو انسان یا حیوان کو اس وادی تک پہنچاتا ہے جہاں وہ پہلے جانے کا تصور بھی نہ کر سکا ہو۔

اترائی

یہ قصبہ گویا کائنات کی ایک ایسی دراڑ میں بسایا گیا تھا جہاں ماضی اور مستقبل نے ہاتھ ملا رکھے تھے۔ یہ نہ مکمل پرانا تھا، نہ مکمل نیا— بلکہ وقت کے تاروں سے بُنا ہوا ایک ایسا خواب تھا جو ہر لمحہ جاگتا رہتا ہے۔ یوں لگتا جیسے تاریخ کی گرد نے مستقبل کی روشنی میں غسل کرلیا ہو، یا جیسے صدیوں پرانی داستان کو کسی روبوٹک قلم سے ازسرِ نو لکھا گیا ہو۔

یہاں کی زمین صدیوں کی صدائیں اپنے سینے میں دبائے بیٹھی تھی۔ گلیوں کی مٹی میں پرانے قافلوں کے قدموں کی چاپ بھی سنائی دیتی، اور جدید مشینوں کے چلنے کی مدھم گونج بھی۔ یہاں کی فضا میں ایک ایسی خوشبو تیرتی تھی جو ایک ہی وقت میں عودِ عرب اور کاربن فیول کی بو جیسی لگتی تھی۔

عمارات میں ایسا تضاد تھا جو یکجہتی کی صورت اختیار کر چکا تھا۔ کچھ عمارتیں یوں دکھتی تھیں جیسے انہیں کسی جادوگر نے وقت کی دھند سے تراشا ہو—اونچے گنبد، محرابیں، لکڑی کے جھروکے؛ اور انہی کے ساتھ چمکتے ہوئے شیشے، خودکار دروازے، اور پرواز کرتے لفٹیں۔ ان گھروں کے اندر فرش پر اجمیر کے قالین بچھے تھے مگر دیواروں پر ہولوگرافک تصاویر جھلملا رہی تھیں۔

یہاں کے باشندے وقت کی لغت سے باہر تھے۔ ان کے چہروں پر جذبات نہیں، کہانیاں لکھی تھیں۔ کچھ انسان مثلث کی صورت میں چلتے تھے، کچھ کے ہاتھ دراز ہو کر اشجار کی شاخیں بن جاتے، اور کچھ کی آنکھوں میں سورج اور چاند کی گردش کا علم رقم ہوتا۔ ان میں سے کوئی ہوا میں معلق رہتا، تو کوئی پانی پر ایسے چلتا جیسے وہ پانی کا بیٹا ہو۔ ان کے وجود میں ہوا، مٹی، آگ، اور روشنی کی آمیزش تھی۔

خوراک میں بھی یہی امتزاج تھا— کبھی انگور کی بیل سے لٹکتے پھل جو دہن میں جا کر مصنوعی توانائی بن جاتے، کبھی مٹی کی ہانڈی میں پکتا قورمہ جو خالص ذائقے سے لبریز ہوتا۔فرنیچر پر دیسی کندہ کاری، مگر اندر سمارٹ سینسرز چھپے ہوئے۔ ان کے لباس میں پرانے زمانے کی چمکدار زری اور جدید دور کی حرکت کے مطابق خود کو ڈھال لینے والی ٹیکنالوجی موجود تھی۔

یہ قصبہ گویا آئینے کا ایک ٹکڑا تھا— جس میں وقت نے اپنا عکس دیکھا اور خود سے ہی شرما کر پردہ اوڑھ لیا۔ یہاں ہر گھنٹہ صدیاں اپنے سینے میں سمیٹے ہوتا، اور ہر لمحہ مستقبل کا کوئی نیا در کھولتا۔

اس بستی کے اسرار میں ایک چہرہ ایسا بھی تھا جو جیسے روشنی سے بنا ہو، اور جس کی مسکراہٹ پھولوں میں خوشبو کی مانند بکھرتی۔ وہ مرد— جس کا اصل نام کسی کو یاد نہ تھا، مگر سب اُسے "محسن" کہہ کر پکارتے— گویا ایک ایسی شمع تھا جس نے خود کو جلایا تا کہ دوسروں کو راستہ دکھا سکے۔

وہ جب کسی گلی سے گزرتا تو پرندے بھی جیسے اپنا نغمہ بدل لیتے، ہوا کا لمس نرم ہو جاتا، اور سورج کی روشنی ذرا مدھم ہو کر اُس کے قدموں کے راستے میں سایہ ڈال دیتی۔ وہ نہ کسی سلطنت کا بادشاہ تھا، نہ کسی وزارت کا وزیر، مگر اس کا دل ان سب تختوں سے بڑا تھا۔

محسن کا ہر دن کسی نہ کسی کی مدد میں گزرتا۔کبھی کسی بوڑھے مزدور کو اپنی چھتری دے دیتا، کبھی کسی یتیم کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے اپنے گھر لے آتا، کبھی کسی بیمار کے لیے دوا خریدنے خود بازار چلا جاتا۔ وہ دولت مند تھا، مگر اس کی دولت صرف بینکوں میں نہ تھی—وہ محبت کی شکل میں ہر دل میں محفوظ تھی۔

اس کے رشتہ دار، جن کے چولہے اُس کی سخاوت سے جلتے تھے، اُسے مشورے نہیں دیتے تھے بلکہ دعائیں دیتے تھے۔ اُس کا ایک بھتیجا جسے تعلیم حاصل کرنے کی خواہش تھی مگر وسائل نہ تھے، محسن نے اُسے شہر کے بہترین ادارے میں داخل کرایا۔اُس کی ایک بہن، جو بیوگی کے اندھیرے میں ڈوب گئی تھی، محسن ہی نے اس کے بچوں کو باپ جیسا پیار دیا۔

دوستوں کے لیے وہ دیوار کی مانند تھا— سہارا بھی دیتا، اور طوفان بھی اپنے سینے پر روکتا۔ایک بار اس کے ایک دوست پر جھوٹا مقدمہ بنا، تو محسن نے نہ صرف اُس کی قانونی فیس دی بلکہ عدالت میں خود گواہی دی۔

اور خادم؟

وہ اُس کے لیے صرف نوکر نہ تھے بلکہ اہلِ خانہ کی مانند تھے۔ ایک دن اُس کا ایک ملازم سخت بیمار ہو گیا، محسن نے اپنی

قیمتی گاڑی نکالی اور اُسے خود لے جا کر شہر کے مہنگے اسپتال میں داخل کروایا۔کبھی کوئی خادمہ روتی نظر آتی، تو وہ اُس کی آنکھیں نہیں، اُس کا دکھ پونچھتا۔

محسن کے رویّے میں ایک ایسی ملائمت تھی جو شاید بارش کے پہلے قطرے میں ہوتی ہے، یا اُس لمس میں جو ماں کے ہاتھ سے بچے کی پیشانی پر پڑتا ہے۔ وہ کسی کے ماتھے پر شکن دیکھتا تو اُس کے دل میں تڑپ اُٹھتی۔ کسی کے چہرے پر مایوسی دیکھتا تو اُسے خوشی کا کوئی بہانہ دے دیتا۔ اُس کی زندگی، دوسروں کی زندگی کو آسان بنانے کا دوسرا نام بن چکی تھی۔

وہ دن بھی عجیب تھا۔ آسمان نیلا نہ تھا، مگر سیاہ بھی نہیں۔ گویا کسی قدیم طشت میں آئینے اور دھند کو ملا کر کوئی مصور پھیلا بیٹھا ہو۔ محسن — وہی شخص جو سب کی زندگی میں روشنی تھا — آج بادلوں پر چل رہا تھا۔ بادل، جو روئی کے گالوں کی مانند اُس کے قدموں تلے بچھے تھے، اس کے لیے کوئی عجیب بات نہ تھی۔ اُس بستی کے لوگ ہوا میں چلتے تھے، پانی پر تیرتے تھے، روشنی میں گم ہوتے تھے۔ مگر محسن کی یہ پرواز کچھ اور ہی تھی۔

یہ سیر نہ غرور کی تھی، نہ فخر کی۔ یہ تو اس سکون کی علامت تھی جو خدمتِ خلق کے بعد دل میں ٹھہر جاتا ہے۔ اُس کی چال میں وقار تھا، نظر میں طمانیت۔ نیچے زمین دھند میں لپٹی تھی، اور بادلوں کے درمیان وہ ایسے چل رہا تھا جیسے کوئی بزرگ صوفی خواب کی گلیوں میں بھٹک رہا ہو۔

مگر پھر... بادلوں نے کچھ سرگوشیاں کیں۔ شاید تھک گئے تھے، شاید تقدیر نے نیا ورق پلٹ دیا تھا۔ محسن کا قدم ایک کونے میں آ لگا، جہاں بادل چھوٹے، کمزور اور بے سہارا تھے۔ ایک لغزش، ایک لحظہ، اور اُس کا پاؤں پھسلا۔

اس کے چہرے پر حیرت چھا گئی، پھر خوف۔ اُس نے فضا کو مٹھی میں پکڑنے کی کوشش کی، مگر ہوا بے وفا نکلی۔ وہ گرتا چلا گیا۔ بادل ایک ایک کر کے اُس سے چھوٹتے گئے جیسے دوستی کے دعوے وقتِ ضرورت مٹی میں رُل جائیں۔

پہلا نعرہ اُس نے اپنے رشتہ داروں کے لیے لگایا۔ آواز بادلوں میں گونجی، مگر جواب میں صرف ایک ہنسی سنائی دی۔ جیسے کسی نے اُسے دیکھ کر کندھے اچکائے ہوں، یا کسی نے چائے کی پیالی سے نظریں ہٹا کر بے نیازی سے مسکرا دیا ہو۔

پھر اُس نے دوستوں کو پکارا۔ آواز میں لرزش تھی، مگر دوستوں کی جانب سے صرف خاموشی آئی۔ جیسے اُس کے درد کو صرف گونگا وقت سمجھ رہا ہو۔ کچھ تو ہنسے بھی، جیسے اُس کی پکار لطیفہ ہو، مذاق ہو۔

آخر کار اُس نے اپنے خادموں کو پکارا، جنہیں وہ بیٹوں کی طرح سمجھتا رہا۔ مگر وہ بھی آسمان پر ٹہلتے ہوئے اُس کے زوال

کا منظر ایسے دیکھ
رہے تھے جیسے کسی فلم کا مزاحیہ سین۔ کچھ نے انگلیاں دکھائیں، کچھ نے قہقہے مارے۔
وہ گرتا گیا، ہر لمحے کے ساتھ زمین قریب آتی گئی، اور اُمید دور۔ اُس کی آوازیں جیسے بادلوں میں گم ہوگئیں، یا شاید دنیا کے شور میں دب گئیں۔
یہ زوال فقط جسمانی نہ تھا، یہ اعتماد کا ٹوٹنا تھا، رشتوں کی حقیقت کا عریاں ہونا تھا۔ وہ شخص جو کبھی بادلوں پر چلتا تھا، اب بیبسی کے عالم میں نیچے جا رہا تھا... اور کوئی نہیں تھا جو اُسے تھام لے۔
وہ گر گیا...
جیسے کوئی مقدس صحیفہ آسمان سے نیچے زمین پر آ گرا ہو اور مٹی میں لت پت ہو گیا ہو۔ ایک زوردار دھماکہ ہوا، جیسے بادلوں نے زمین سے بوسہ لیا ہو۔ اُس کا جسم ٹوٹا نہیں، بکھر گیا۔ پسلیاں جیسے خشک شاخیں، بازو جیسے چٹخے ہوئے ستون، ٹانگیں جیسے سوکھے نالے میں ٹوٹا پل، اور چہرہ... ؟ چہرہ تو پہچانا نہ گیا۔ اُس کے ماتھے پر جو نور کی لکیریں تھیں، اب وہ دھندلے دھبے بن چکی تھیں۔
زمین خاموش تھی۔ نہ کوئی چیخ، نہ کوئی ماتم۔ صرف وقت کے قدموں کی چاپ تھی جو اُسے روندتی ہوئی گزر رہی تھی۔ اور وہ... وہ اپنے بکھرے ہوئے وجود کو دیکھ کر مسکرا دیا۔ ایک زخم سے خون بہہ رہا تھا، مگر اُس کا چہرہ جیسے سنگِ مرمر بن چکا تھا— بیحس، بیحرکت۔
پھر... اُس نے اپنی انگلیوں کو جنبش دی۔ ایک ہڈی چٹخی، مگر اُس نے اسے سراہا، جیسے طبلِ بغاوت بجا ہو۔ وہ آہستہ آہستہ کھڑا ہونے لگا۔ ہر قدم پر درد کی چیخ، ہر حرکت پر زخموں کی شعلہ فشانی۔ مگر وہ اٹھا، اور یوں اٹھا جیسے کسی نے اپنے وجود کی قبر سے دوبارہ جنم لیا ہو۔
اُس نے ایک کرتب دکھایا، پھر دوسرا۔ جسم کی ہر ہڈی جیسے نئی سرشاری سے جُڑ گئی۔ چہرے کی سلوٹیں کھلیں، آنکھوں کی روشنی واپس آئی، اور وہی پرانا وقار، مگر اب اُس میں کچھ اور بھی تھا— سختی، سرد مہری، ایک جمی ہوئی چٹان جیسی بےنیازی۔
اسی لمحے ایک پرانا خادم اُس کے پاس آیا، ہاتھ جوڑے، آنکھوں میں خوشی۔
"حضور! سلام، آپ کی طبیعت کیسی ہے؟

مگر محسن کا چہرہ ساکت رہا پھر اُس نے اُسے جھڑک دیا، آواز میں زہر گھلا ہوا تھا۔

"جا! اب میرے قریب مت آنا۔ تم سب... تم سب مٹی سے بھی کمتر ہو۔"

خادم پیچھے ہٹ گیا، اور محسن... جنہیں لوگ نور کہتے تھے، اب ظلام بن چکا تھا۔ وہ خاموشی سے مڑا، اور اُس طرف چل دیا جہاں روشنی مر چکی تھی—ایک تاریک کوٹھڑی کی سمت، جس کے در و دیوار سیاہی سے بنے تھے، اور جہاں وقت ساکت کھڑا تھا۔

کوٹھڑی کا دروازہ بند ہو گیا، جیسے کسی امید کا کفن لپیٹا گیا ہو۔

من و تو

"تو ہمیشہ مجھے ہی کیوں الزام دیتا ہے؟"

" کیونکہ غلطی ہمیشہ تیری ہوتی ہے۔ تُو ہی وہ ہے جو اندھیرے میں چھپتا ہے، اور روشنی سے ڈرتا ہے۔"

"روشنی؟ وہی روشنی جس میں تیرے گناہ صاف نظر آتے ہیں؟"

"میں گناہ گار؟ تجھ میں حیا ہوتی تو اپنے چہرے پر نظر ڈالتا۔ ہر دھوکہ، ہر فریب، ہر جھوٹ، ہر مکاری تیرے ماتھے پر کندہ ہے"!

"اور تُو؟ تُو کون سا دودھ کا دھلا ہے؟ جس دن ماں کا خواب چُرا کر اپنی خواہشوں کا تاج پہنایا، وہ دن بھولا نہیں"!

"میں نے کبھی اپنی خواہش کو مسلط نہیں کیا۔ تُو وہ ہے جو دوسروں کے ارادے اپنے فائدے میں بدلتا ہے، جیسے ہنر کے جام میں زہر گھول دے"!

" میرے لفظ زہر نہیں، آئینہ ہیں۔ تیرے منہ سے نکلی ہر بات، دوسروں کو تکلیف پہنچاتی ہے، اور تُو اسے سچ سمجھتا ہے۔"

"سچ وہی ہے جو آنکھوں کو چبھ جائے۔ اور تُو وہ ہے جو نرم گفتاری میں زہر چھپاتا ہے۔"

"تو اگر نیکی ہے تو کیوں ہر فیصلہ تیرے ہاتھوں سے چھن کر میرے دِل پر وار کرتا ہے؟ کیوں ہر رات کی خاموشی میں تیرا سایہ میرا تعاقب کرتا ہے؟"

"اس لیے کہ تیرے اندر کا سچ تجھے خود قبول نہیں۔ تُو اپنی اصل سے بھاگتا ہے، اور الزام میرے سر ڈال دیتا ہے۔"

"تو کہتا ہے میں بدی ہوں؟ تو نے کتنی بار رحم کو کمزوری کہا، اور بے حسی کو طاقت؟"

"تُو نے کتنی بار جذبے کو گناہ سمجھا، اور عقل کو بت بنا کر پوجا؟"

"نیکی وہی ہے جو دل کو چین دے۔"

"اور بدی وہی جو ضمیر کو سونے نہ دے۔"

"پھر بتا— جب رات کو ہم بستر پر لیٹتے ہیں، تو کس کا چہرہ آنکھوں میں تیرتا ہے؟ میرا یا تیرا؟"

"بس کر! اب بات دل سے نکل کر خون میں اتر چکی ہے۔"

"تو سمجھتا ہے تُو فرشتہ ہے؟"

"اور تُو؟ شیطان بھی تجھ سے پناہ مانگے"!

"بس بہت ہو چکا... اب اصل سوال یہ ہے— میں ہوں یا تُو ؟"

"یہی تو میں بھی پوچھ رہا ہوں۔ تُو ہے کون؟ سایہ یا سایے کا عکس؟"

"سایہ تو روشنی سے پیدا ہوتا ہے، اور تُو... تُو تو اسی روشنی کا محتاج ہے۔ بغیر میرے تیرا وجود ہی کیا ہے؟"

"بغیر میرے تُو خود کو دیکھ بھی نہ سکے۔ میں تیرا عکس ہوں، لیکن تیرا عکس نہیں— تیری اصل ہوں"!

"تُو جو میرے ہر انداز کو نقل کرتا ہے، ہر جنبش، ہر نگاہ، ہر لرزش کو دہراتا ہے— تُو کیسے اصل ہو سکتا ہے؟"

"اور اگر میں تیرے بعد حرکت کرتا ہوں، تو کیا یہ ثابت کرتا ہے کہ میں تابع ہوں؟ شاید یہ محض تاخیر نہیں، بلکہ غور و فکر کی علامت ہے"!

"غور و فکر؟ یہ بھی کیا خوب کہا تُو نے! عکس اگر سوچنے لگے تو عکس ٹوٹ جائے"!

" کبھی سوچا کہ عکس اگر پلک جھپکنے لگے، تو پلکیں کس کی بند ہوتی ہیں؟"

"تُو خواب ہے، جسے میں آنکھ کھول کر دیکھتا ہوں۔ اور خواب حقیقت نہیں ہوتا"!

"پر کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ حقیقت، خواب بن جائے؟ کہ تُو نیند سے جاگے اور خود کو میرے اندر قید پائے؟"

"تُو قیاس ہے، میں وجود۔ تُو خیال ہے، میں حقیقت"!

"اور اگر وجود ہی سچ ہو، تو تُو اپنے اندر کے سچ سے کیوں گھبرا رہا ہے؟"

" کیونکہ میرا سچ مجھے ڈراتا ہے... اور تُو وہی سچ ہے جسے میں جھٹلا رہا ہوں"!

"تو پھر مان لے— ہم دونوں ہی سچ ہیں، یا دونوں ہی فریب"!

"نہیں! دو سچ نہیں ہو سکتے۔ یا میں ہوں، یا تُو۔ اور اگر تُو نکلا حقیقت، تو پھر میرا وجود؟"

"وہی سوال میں بھی پوچھتا ہوں۔ اگر تُو اصل ہوا، تو میں کس کا عکس ہوں؟"

"اگر ایک دن عکس خاموشی سے جواب دے دے، تو کیا ہوگا؟"

"پھر... پھر شاید ہم دونوں خاموش ہو جائیں—یا ایک ٹوٹ جائے"!

"کاش میں تجھے مار ڈالوں"!

"کیا خیال ہے؟ اگر تُو مجھے مار دے، تو کیا میں مروں گا—یا تُو؟"

"بس ایک جھٹکا، ایک وار... اور یہ سایہ ہمیشہ کے لیے مٹ جائے"!

"پر کیا تو نے کبھی سایہ کو قتل ہوتے دیکھا ہے؟ اگر عکس مر گیا، تو کیا آئینہ خاموش رہے گا؟"

"خاموشی؟ یہ آئینہ چیخے گا، چیخے گا میرے خالی پن سے"!

"یا شاید، وہ تیرے وجود کی موت پر ماتم کرے گا؟"

"تُو صرف ایک فریب ہے، اور فریب کو ختم کرنا... خود کو آزاد کرنا ہے"!

"اور اگر میں فریب نہیں ہوں؟ اگر تُو ہی عکس ہے؟ اگر میرا خاتمہ، تیرا خاتمہ ہو؟"

"اگر تُو اصل ہوا... تو کیا میں صرف تیری پرچھائیں ہوں؟ پھر میرا خنجر، میری نفرت، میری چیخیں سب بے معنی؟"

"اور اگر میں عکس ہوا، اور تُو مر گیا، تو کیا میں خالی ہوا میں تحلیل ہو جاؤں گا؟"

"نہیں! میں اصل ہوں، میں ہوں جس کے دل میں خوف ہے، جس کی آنکھوں میں آنسو ہیں، جس کے ہاتھ میں خنجر ہے"!

"پر آنسو تو میرے بھی بہتے ہیں، میرا خنجر بھی لرز رہا ہے، میرے دل کی دھڑکن بھی سن"!

"بس کر! یا تُو مرے گا، یا میں"!

"پھر فیصلہ کر—اگر تُو عکس ہے، تو میں بھی عکس ہوں۔ اور اگر تُو حقیقت ہے، تو مجھے فنا کرنے کی قیمت... تیری موت ہو گی"!

"میں تیار ہوں... شاید دونوں میں سے ایک کو مرنا ہی ہوگا تاکہ دوسرے کی حقیقت ثابت ہو سکے"!

"تو آ جا، وار کر، لیکن یاد رکھ—اگر تُو عکس ہے، تو تیرا وار تجھ پہ ہی الٹ جائے گا"!

"بس! اب فیصلہ وقت آ گیا ہے"!

"آ جا... میں تیار ہوں۔"

"تُو عکس ہے! جھوٹ ہے! فریب ہے"!

"ابّا؟"

ایک دس بارہ سالہ لڑکا دروازے پر کھڑا ہے۔ اس کی آنکھوں میں حیرت اور خوف کا امتزاج ہے۔ وہ بھاگتا ہے، زخمی شخص کے قریب بیٹھتا ہے۔

"ابّا! کیا ہوا؟ یہ خون... یہ آئینہ"...

کسی جواب کی گنجائش نہیں۔ مرد بیہوش ہے، اس کی مٹھی میں اب بھی ایک شیشے کا ٹکڑا دبا ہوا ہے۔ اس کا چہرہ یوں لگتا ہے جیسے وہ ابھی ابھی کسی جنگ سے لوٹا ہو—ایک جنگ جو کسی اور کے ساتھ نہیں، خود اپنے آپ کے خلاف تھی۔

آئینہ ٹوٹ چکا ہے، اور اس کے ساتھ وہ فریب بھی جو سالوں سے چہرے پر سچ کا پردہ ڈالے ہوئے تھا۔

زندہ کردار

جب سورج اپنے طلوع میں سونا برساتا تھا اور چاندنی اپنی چادر میں خواب بُنتی تھی۔
ایسا زمانہ جو کتبِ کہنہ کے اوراق میں، یا بزرگوں کی نیم خوابیدہ آنکھوں کی سرگوشیوں میں کہیں چھپا تھا۔
کسی بھولی بسری دنیا کے کنارے، گھنے جنگلوں اور شفاف ندیوں کے سنگم پر، ایک گاؤں آباد تھا۔ نہ وہ گاؤں کسی نقشے پر تھا، نہ کسی سیاح کی یادداشت میں۔ بس، وہ انہی دلوں میں زندہ تھا جو خوابوں کو بیداری سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔
گاؤں کے مکانات مٹی اور لکڑی کے نہیں، بلکہ کچی روشنیوں اور خوشبودار دھند سے بنے تھے۔ ہر گھر کے دروازے پر بیلیں تھیں جو خوشی اور اداسی کی کہانیاں سرگوشی کرتی تھیں۔ گلیاں پتھروں سے نہیں، نقرئی ریشوں سے بنی تھیں، جن پر چلتے ہی قدموں کے نیچے نرم گھنٹیاں بجنے لگتیں۔
ہوا میں عطرِ گلِ مریم کی لہر دوڑتی رہتی تھی۔ پرندے رنگین پروں والے تھے جو باتیں کرتے، قہقہے لگاتے، اور کبھی کبھی اَن کہی کہانیاں چہچہاتے۔ شام ڈھلے جب سورج نیند میں جانے لگتا تو پورا گاؤں نیلگوں دھند میں لپٹ جاتا، اور درختوں کی شاخوں پر سنہری جگنو لٹک جاتے، جیسے آسمان نے اپنی ستاروں بھری چادر نیچے لٹکا دی ہو۔
ندی کے پار ایک پہاڑی تھی، جس پر کبھی کبھار ایک سنہری ہرن نمودار ہوتا اور اپنی آنکھوں سے ان کہی کہانیاں سناتا۔ اور جب بارش برستی تو گاؤں کے تالابوں میں کمل کے پھول نہیں، خواب کھلتے تھے۔
یہ گاؤں بظاہر چھوٹا تھا، مگر اس کے اسرار کا دامن لامحدود۔ یہاں وقت بھی رکتا تھا، اور کہانیاں بھی سانس لیتی تھیں۔
یوں لگتا تھا کہ اس گاؤں کو کسی قدیم جادوگر نے خواب اور حقیقت کے مابین کہیں پرو دیا ہو۔

اُسی خوابیدہ گاؤں کے ایک کنارے، ایک برگد کے قدیم درخت کی چھاؤں میں ایک جھونپڑی نما مکان تھا۔ مگر وہ جھونپڑی عام نہ تھی؛ اس کی دیواریں خوشبوؤں سے بنی تھیں اور اس کی چھت شبنم کی بوندوں سے جڑی ہوئی تھی۔ اسی مقام پر وہ افسانہ نگار رہتا تھا جسے لوگ " کہانیوں کا جادوگر " کہتے تھے۔ اس کا نام ارسل خلیق تھا۔

اس کی آنکھیں ایسی تھیں جیسے دو گہرے کنویں ہوں، جن کی تہہ میں رازوں کی پرچھائیاں ہچکولے کھا رہی ہوں۔ اس کی داڑھی چاندنی کی طرح سفید تھی اور بالوں میں خزاں کی ہوا بسی ہوئی تھی۔

چال ایسی کہ جیسے کوئی پرانی سرگوشی زمین پر قدم رکھ رہی ہو، اور لہجہ ایسا کہ ہر لفظ سے کوئی نیا طلسم ابھرتا ہو۔

اس کے معمولات بھی عجیب تھے۔ وہ صبح دمندی ہوا کے ساتھ بیدار ہوتا، ایک نہر کے کنارے بیٹھ کر طلوعِ آفتاب کی مسکراہٹ پینے لگتا، پھر اپنے جھونپڑی نما کمرے میں آ کر انوکھی کہانیاں بُننے لگتا۔ اس کی میز پر قلم نہیں ہوتے تھے، بلکہ پتلے شفاف پرندے بیٹھے ہوتے، جن کے پروں سے وہ الفاظ تراشتا تھا۔

وہ کاغذ پر سیاہی سے نہیں، ہوا سے لکھتا تھا؛ اور اس کی تحریریں، جب مکمل ہوتیں، تو پھولوں کی صورت گرتی تھیں۔ اس کی کہانیاں عام قصے نہ تھیں — وہ ایسی دنیا بساتیں جہاں خواہشیں بھی جسم اختیار کر لیتیں اور خیالوں کو پر لگ جاتے۔

عجیب تھا اس کا ذوق —

وہ خوشبو کو شکل دیتا، سایے کو آواز بخشتا، ہوا میں کہانیاں بنتا اور دھند میں کردار تراشتا۔

وہ اپنے گاؤں کی عجیب مخلوقات سے کہانیاں کشید کرتا؛ کبھی سنہری ہرن کی آنکھوں سے کوئی داستان چراتا، کبھی جگنو کی روشنی میں کوئی خواب لکھتا۔

اس کے ملبوسات بھی اسی دیس کے تھے: نازک سفید کپڑا جس پر نیلگوں ستاروں کی کڑھائی ہوتی۔

جوتے نہیں پہنتا تھا، کیونکہ اس کا عقیدہ تھا کہ زمین کی کہانیاں صرف ننگے قدموں سے سنی جا سکتی ہیں۔

لوگ اسے دیکھنے آتے مگر وہ شاذ و نادر ہی کسی سے بات کرتا۔ اکثر کہا کرتا:

" کہانی سنانے والے کی سب سے بڑی عبادت خاموشی ہے، تاکہ لفظ خود سفر کر سکیں۔"

یوں وہ اپنی خلوت میں کہانیوں کے طلسماتی باغ اگاتا رہا، اور اس کا ہر قصہ، ہر افسانہ، ہوا میں تتلیوں کی صورت بکھرتا رہتا۔

ایک شام، جب غروبِ آفتاب کے وقت آسمان پر نیلے اور سنہری رنگ دھندلے دھندلے لپک رہے تھے، افسانہ نگار

نے ایک انوکھا قصہ لکھا: "نیلم آنکھوں والی پری"۔
وہ کہانی ختم کر کے خاموشی سے جھونپڑی کے باہر نکلا اور درختوں کی سرسراہٹ سننے لگا۔
اچانک... ایک مدھم سی ہنسی کی آواز آئی، جیسے ہوا میں کوئی ساز بج اٹھا ہو۔
پلٹ کر دیکھا تو سامنے واقعی ایک نیلم آنکھوں والی ننھی پری کھڑی تھی، جس کے لباس پر شبنم کے قطرے موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔
وہی ہیولیٰ، وہی مسکراہٹ، جو اس نے کہانی میں لکھی تھی!
پہلے تو اس نے گمان کیا کہ یہ کسی خواب کا اثر ہے، مگر جب اس پری نے جھک کر ادب سے سلام کیا تو اس کے بدن میں کپکپی دوڑ گئی۔

چند دن بعد، ایک اور عجیب واقعہ ہوا۔
اس نے ایک کہانی لکھی تھی "چمکتی تلوار والا بہادر"، جو ہمیشہ گاؤں کو اجنبی خطرات سے بچاتا تھا۔
ایک روز صبح سویرے گاؤں کے بچے دوڑتے ہوئے آئے کہ "بزرگو! ایک تلوار بردار شخص نے رات ڈاکوؤں کو بھگا دیا ہے"!
اور جب وہ خود جا کر دیکھنے گیا، تو ایک سجیلا نوجوان اپنے تلوار کے ساتھ دور میدان میں سورج کے عکس میں جگمگا رہا تھا، بالکل ویسا ہی جیسا اس نے اپنے افسانے میں تراشا تھا۔
تیسری دفعہ، اس نے ایک کہانی "آنسو بہاتی بادل کی رانی" لکھی — جو روتے روتے بارش برساتی تھی۔
چند دن بعد گاؤں میں ایسی نرم و نازک بارش شروع ہوئی، جس میں پھول کھلتے تھے اور زمین مہک اٹھتی تھی۔
لوگوں نے بادلوں میں ایک عورت کے ہیولے دیکھے، جو سر جھکائے رو رہی تھی۔
اس پراسرار تسلسل نے اس کے دل میں ایک سنسنی بھر ادی۔
کیا یہ محض اتفاق تھا؟
کیا اس کی تخلیقات واقعی زندگی پا رہی تھیں؟
ہر نئی تحریر کے بعد، ہر نیا کردار یا منظر، جیسے اس مٹیالی وادی میں سانس لینے لگتا۔
راتوں کو وہ جاگ جاگ کر سوچتا، اور جب جھونپڑی کے اندر طلسماتی چراغ جلتا، تو یوں لگتا جیسے الفاظ کمرے کی

دیواروں سے نکل کر فضا میں رقص کر رہے ہوں۔

آخر کار، شواہد اتنے زیادہ ہو گئے کہ شک کی کوئی گنجائش نہ رہی۔

وہ ماننے پر مجبور ہو گیا کہ اس کے قلم میں زندگی بخشنے کی قوت جاگ اٹھی ہے۔

ایسی قوت جسے نہ وہ خود سمجھ سکا، نہ کبھی بیان کر سکا۔

مگر ساتھ ہی دل میں ایک سرگوشی بھی ابھری:

"اگر میں دوسروں کو تخلیق کر سکتا ہوں... تو خود کو کیوں نہیں؟"

یہ خیال بجلی کی طرح اس کے وجود میں دوڑ گیا۔

چاندنی رات میں، جب پوری وادی دودھیا روشنی میں نہا رہی تھی اور دیودار کے درخت چپ چاپ کوئی پرانا گیت گنگنا رہے تھے، وہ تنہا اپنے چراغ کے پاس بیٹھا سوچ رہا تھا۔

سرمئی دھوئیں کے مرغولے چھت سے لپٹ کر آسمان کی جانب پرواز کر رہے تھے اور افسانہ نگار کے دل میں ایک بےچین سرگوشی گونج رہی تھی:

"میں دوسروں کو حیات دے سکتا ہوں... تو خود کو کیوں نہ دے دوں؟"

اس خیال نے اس کے اندر ایک لہر سی دوڑا دی، جیسے صدیوں سے سوئی ہوئی تمنائیں جاگ اٹھی ہوں۔

وہ سوچنے لگا:

"اگر میں اپنا ایک ایسا کردار تخلیق کر لوں جو مجھ سے جدا ہو مگر پھر بھی میرا عکس ہو،

تو میں ہمیشہ زندہ رہ سکتا ہوں،

ہمیشہ نئی کہانیاں تخلیق کر سکتا ہوں،

نہ وقت میرا کچھ بگاڑ سکے گا نہ فنا۔"

ایک بیمثال منصوبہ اس کے ذہن میں پنپنے لگا:

وہ ایک ایسا افسانوی کردار بنائے گا جو خود بھی کہانیاں لکھے گا،

اور پھر وہ کردار اپنے ہی جیسا ایک اور تخلیق کرے گا،

اور یہ سلسلہ ازل تا ابد چلتا رہے گا— ایک لامتناہی زندگی، جو کہانیوں کے بطن سے جنم لیتی رہے گی۔

چراغ کے قریب بیٹھ کر اس نے پرانی قلم دوات نکالی۔

کسی جادوزدہ لمحے میں اس کے ہاتھ خود بخود حرکت کرنے لگے۔

اس نے لکھنا شروع کیا:

"وہ ایک دیہاتی افسانہ نگار تھا. اس کا نام ارسل خلیق تھا.. اس کے تخیل کی پرچھائیاں حقیقت بن جاتی تھیں۔

ایک دن اس نے چاہا کہ وہ خود کو کہانی میں ڈھال دے تاکہ وقت کا جبر اس پر کبھی نہ آئے"...

الفاظ کے ساتھ جیسے وہ اپنا وجود کاغذ پر انڈیل رہا تھا۔

ہر جملے کے ساتھ وہ ہلکا ہوتا جا رہا تھا،

جیسے اس کا گوشت پوست مٹ کر لفظوں میں گھلتا جا رہا ہو۔

جونہی کہانی مکمل ہوئی، چراغ کی لو زور سے بھڑکی،

کمرے میں تیز ہواؤں کا شور گونجا، یک دم اندھیرا چھا گیا، پھر روشنی ہوئی۔

کمرے میں دو بچے بیٹھے تھے ایک کے ہاتھ میں ایک پرانی سی کتاب تھی۔

یہ کتاب میں نے پڑھ لی ہے، بہت مزے مزے کی کہانیاں ہی، خاص طور پر ارسل خلیق کا کردار مجھے بہت پسند آیا، کیا سچ مچ ماضی میں کوئی ایسا شخص تھا؟

ارے نہیں یہ تو بس ایک کردار ہے حقیقت میں تو ایسا کوئی انسان نہیں تھا۔

شاہ کار

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب روشن سلطنت کا سورج کبھی غروب نہ ہوتا تھا اور دنیا کے افق پر اُس کی عظمت ایک لازوال تمثیل کی مانند چمکتی تھی۔ جب کوہِ الماس کی برفیں شہنشاہوں کے کنگنوں میں مرصع ہوتی تھیں اور دریائے ہرمن کے کنارے خیمہ زن لشکر خوابِ فتح کی تعبیر بنتے تھے۔

روشن — جسے وقت نے تاج پہنایا تھا اور تاریخ نے سنگِ مرمر کی طرح تراشا تھا — اپنی جولان گاہوں میں دیوتاؤں کے گیت بکھیرتا، قوسِ قزح کے رنگوں سے سجے باغات، سونے کی لکیروں سے مزین محرابیں، اور خوشبوؤں سے لبریز بازاروں کا شہر تھا۔ یہاں کی گلیاں گویا افسانوی نظموں کے مصرعے تھیں، اور فصیلوں سے جھانکتے مینار، فلسفیوں کی بلند سوچوں کی علامت۔

موسیقاروں کی انگلیوں سے بجتے ساز جب سنگِ مرمر کی عمارتوں سے ٹکراتے تو ہوائیں گیت گنگناتی تھیں۔ یہاں کے مجسمہ ساز جیسے دیوتاؤں کے خوابوں کو چن چن کر سنگ تراشی میں ڈھالتے۔ اور شاعروں کے قلم سے نکلنے والے استعارے، صدیوں کے بعد بھی گونجتے محسوس ہوتے۔

اس سلطنت میں — جہاں ہر فنکار ایک فطرت کے پیغام بر کی حیثیت رکھتا تھا اور ہر گلی اپنے اندر کوئی راز چھپائے بیٹھی تھی — ایک فنکار ایسا بھی تھا، جسے لوگ "روح کا مصور" کہا کرتے۔

وہ شخص کوئی عام فنکار نہ تھا۔ اس کی آنکھوں میں جھیل کی گہرائیاں، چہرے پر سمندر کے جزر و مد، اور قد میں کوہِ تخیل کی بلندیاں تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی دیوتا کی مٹی سے تراشا گیا ہو — مگر فرق صرف یہ تھا کہ اس کی طاقت بازو

میں نہیں، بلکہ تخیل میں تھی۔

اس کے لمبے بال جیسے صنوبر کے پیڑوں پر شبنم کی بوندیں لرزتی ہوں، اور اس کے ہاتھ، وہ ہاتھ جیسے چاندنی میں نہائے ہوئے پرانے مندر کے ستون — نرم، سنجیدہ، مگر فیصلہ کن۔ وہ جب کینوس پر پہلی لکیر کھینچتا، تو جیسے وقت کا بہاؤ رک جاتا، اور فضا پر اک خوابناک خاموشی طاری ہو جاتی۔

اس کی تخلیقات کی شہرت روشن کے دالانوں سے نکل کر دور دراز کے ساحلوں تک پہنچی تھی۔ مگر ان میں سب سے انوکھی بات یہ تھی کہ وہ صرف چہرے نہیں بناتا تھا، زندگیاں بناتا تھا۔

اس کی تصویریں صرف تصویریں نہیں تھیں، وہ علامات تھیں — وقت سے بلند، وجود سے ماورا۔

لوگ کہتے تھے، اس کے رنگ زندگی کی زبان بولتے ہیں، اور اس کی لکیریں، تقدیر کی تحریریں معلوم ہوتی ہیں۔ مگر وہ شخص خود خاموش رہتا، بس اپنی نظروں سے بات کرتا۔

وہ کہتا تھا:

"میں تصویریں نہیں بناتا، میں وقت میں کھڑکیاں کھولتا ہوں۔"

اب وہ ایک نئی تخلیق کے لیے بے تاب تھا — ایک ایسی تصویر جس میں صرف وقت نہیں، خود زندگی قید ہو۔ جو ایک شاہ کار ہو۔

ایک شام، جب سورج روم کے سنگِ مرمر محلّات کے پشتوں پر لال شعلے بن کر پگھل رہا تھا، اور ہواؤں میں نیلگوں شفق کے سرسراہٹیں گونج رہی تھیں، فنکار نے اپنے کمرے میں داخل ہو کر کینوس کے سامنے کھڑے ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔

اس نے کوئی عام تصویر بنانے کا فیصلہ نہیں کیا تھا۔

اس نے وہ تصویر بنانے کا ارادہ کیا تھا جو ابھی وجود میں نہیں آئی، جس کا لمحہ ابھی آنے والا تھا — ایک صدی بعد کا لمحہ۔

اس کی انگلیوں میں ایک عجیب سی لرزش تھی، جیسے تاریخ کا کوئی تار چھیڑ دیا گیا ہو۔ دن ہفتوں میں، اور ہفتے مہینوں میں بدل گئے۔ وہ اپنی کھڑکی کے پردے گراتا، دروازے بند کرتا، اور خود کو رنگوں، خاکوں اور سائے میں گم رکھتا۔

وہ تصویر کسی معمولی خاندان کی نہیں تھی، بلکہ وقت کی ایک کہانی تھی۔

اس تصویر میں ایک باپ تھا — اس کی پیشانی پر عصرِ حاضر کی تھکن، مگر آنکھوں میں آنے والے کل کی امید تھی۔ ایک ماں تھی، جس کے دامن میں قربانیوں کا سمندر تھا، اور دونوں بیٹے — ایک بلند نظر، ایک خاموش مگر بیدار۔ ایک بیٹی

بھی، جو مستقبل کی آنکھوں میں جھانکنے کی جرات رکھتی تھی۔

یہ سب کسی عمارت کے سامنے کھڑے تھے، جیسے کسی عجائب گھر یا گیلری کے۔ وہ ایک دوسرے سے مخاطب تھے، جیسے کسی ایسے فن پارے پر گفتگو کر رہے ہوں جسے انہوں نے ابھی دیکھا ہو۔

فنکار جب ان چہروں کو تراشتا، تو اس کا ہاتھ رک جاتا— "کیا یہ لوگ میرے ہاتھ کے کمال سے نکلے ہیں؟ یا میری روح کے کسی بھید سے؟"

تصویر مکمل ہونے تک، اس کے چہرے پر نور کی ایک باریک پرت تھی، جیسے وہ کچھ کھو رہا ہو... یا کچھ پا رہا ہو۔

جب آخر کار تصویر مکمل ہوئی، تو وہ کمرے کے بیچوں بیچ آ کر کھڑا ہو گیا۔ کینوس کے سامنے، خاموش، سنبھلتے ہوئے، جیسے کوئی مصوّر نہیں بلکہ ایک عالمِ بالا کا دربان کھڑا ہو۔

اس کی نگاہیں اس تصویر میں چھپے ہوئے مستقبل کو دیکھنے لگیں— لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ تصویر بھی اُسے دیکھنے لگی ہے۔

کمرے میں ایک عجیب سی خاموشی تھی— وہ خاموشی جو برفباری کے پہلے لمحے میں ہوتی ہے، یا کسی قدیم دروازے کے کھلنے سے پہلے۔

فنکار نے ایک قدم پیچھے ہٹا اور تصویر کو بغور دیکھنے لگا۔

وہ بے حد خوبصورت تھی، شاید اس کی تخلیقات میں سب سے زیادہ حقیقت کے قریب۔

پھر، اچانک—

کچھ بدلا۔

وہ پہلے پہل نہیں سمجھ سکا، مگر جیسے جیسے لمحے گزرے، تصویر کی آنکھیں زیادہ گہری، زیادہ زندہ محسوس ہونے لگیں۔

اب وہاں صرف رنگ نہیں تھے، وہاں روشنی تھی۔

اب وہاں صرف چہرے نہیں تھے، وہاں روحیں تھیں۔

پھر ایک پلک جھپکی۔

فنکار نے سانس روکی۔

پھر دوسری آنکھ جھپکی، پھر ایک اور، پھر سب کی!

"یہ... یہ کیا ہو رہا ہے؟" وہ زیرِ لب بڑبڑایا، مگر اس کی اپنی ہی آواز اُس سے پرے محسوس ہونے لگی۔

اب تصویر میں کھڑے افراد نے آہستہ آہستہ لب ہلانے شروع کر دیے۔

ایک لمحے بعد، ایک مدھم سی سرگوشی سنائی دی—

" کیا شان دار تصویر ہے!"...

اب وہ صرف متحرک نہیں تھے، وہ بول رہے تھے۔

" یہ فنکار بہت عجیب ہے، اتنی حقیقت پسندی؟" ایک نوجوان کی آواز آئی۔

" ہاں، لگتا ہے جیسے یہ تصویر کسی نے دِل سے بنائی ہو، " ایک عورت نے سرگوشی کی۔

" لیکن یہ تصویر کس کی ہے؟" سب سے چھوٹے لڑکے نے کہا۔

پھر وہ سب مُڑ گئے۔

مُڑ کر ایک تصویر کو دیکھنے لگے—

ایک خیالی مصور کی تصویر تھی جس کے چہرے پر عجیب سی سرشاری نمایاں تھی۔ اس کے لمبے بال جیسے صنوبر کے پیڑوں پر شبنم کی بوندیں لرزتی ہوں، اور اس کے ہاتھ، وہ ہاتھ جیسے چاندنی میں نہائے ہوئے پرانے مندر کے ستون۔ اس کی آنکھوں میں جھیل کی گہرائیاں اور قد میں کوہِ تخیل کی بلندیاں تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی دیوتا کی مٹی سے تراشا گیا ہو۔

نمائش میں کھڑے یہ لوگ حیرت سے اس مصور کی اپنی تصویر دیکھ رہے تھے۔

اعزاز

یہ شہر محض عمارتوں، سڑکوں اور روشنیوں کا مجموعہ نہ تھا، بلکہ تہذیب، تمدن اور تدبر کا جیتا جاگتا استعارہ تھا۔ ہوا یہاں خوشبو سے لبریز، شامیں چراغوں سے روشن، اور صبحیں سورج کے نور سے مسحور تھیں۔ ہر سڑک کسی خواب کی تعبیر، ہر عمارت کسی خواب کی تکمیل، اور ہر فرد کسی خواب کی تصویر معلوم ہوتا تھا۔

یہ شہر اپنے آپ میں ایک مکمل تمدنی کتاب تھا جس کے ہر باب میں عقل، مہارت، شائستگی اور خوش ذوقی کے عنوانات ثبت تھے۔ یہاں کے پارکوں میں بچے ہنستے کھیلتے، فٹ پاتھ پر چلتے لوگ مہذب گفتگو کرتے، اور گاڑیوں کی آوازوں میں بھی ایک قرینہ محسوس ہوتا۔

یہ وہ شہر تھا جہاں وقت صرف گزرتا نہیں تھا، بلکہ نکھرتا تھا۔ یہاں کی شاہراہیں درختوں کے سائے میں ڈھکی ہوئی تھیں، اور ہر درخت گویا اپنے تنے میں کسی معمار کی دعا محفوظ کیے ہوئے تھا۔ راتوں میں بلند و بالا عمارتیں جگمگاتی تھیں جیسے آسمان زمین پر اتر آیا ہو۔

اس شہر میں صرف سہولیات نہیں تھیں، احساس بھی تھا؛ صرف جدیدیت نہیں، روایات کا احترام بھی تھا۔ اسپتال، اسکول، آرٹ گیلریاں، تھیٹر ہالز، سب کچھ اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ موجود تھا، مگر سب سے زیادہ توجہ جس منصوبے پر مرکوز تھی، وہ تھا "نور میڈیکل کمپلیکس — "ایک عظیم الشان اسپتال جس کا سنگِ بنیاد ایک مشہور اور محبوب معالج نے اپنے والد کے خوابوں کو حقیقت کا روپ دینے کے لیے رکھا تھا۔

یہ اسپتال صرف علاج گاہ نہ تھا، بلکہ علم، انسان دوستی اور خدمت کا نشان تھا۔ اس کا فنِ تعمیر جدیدیت اور روایت کا حسین

امتزاج تھا۔ شیشے کی دیواریں، دھاتی ستون، نرم سبزہ زار، اور اندرونی حصہ ایسا کہ مریض قدم رکھتے ہی شفا کی امید باندھ لے۔

اور اب وہ دن قریب آ چکا تھا جب اس خواب کو حقیقت میں بدلتے دنیا اپنی آنکھوں سے دیکھنے والی تھی۔ شہر کے ہر فرد کی نگاہیں اس جانب مرکوز تھیں، ہر دل اس افتتاحی لمحے کا منتظر تھا، اور ہر زبان پر ایک ہی نام تھا... ڈاکٹر ارمغان حیات۔

ڈاکٹر ارمغان حیات اس شہر کا وہ نام تھا جو محض شناخت نہ تھا، بلکہ ایک اعتماد، ایک مسکراہٹ، ایک امید کا نام تھا۔ عمر کی پچاسویں دہلیز پار کر کے بھی وہ ایسے دکھائی دیتے جیسے کسی تازہ کھلے گلاب کی شاخ پر شبنم کی بوند ٹھہری ہو — متانت، وقار اور تازگی کا امتزاج۔

قد درمیانہ، جسم مناسب، اور چہرے پر ایک ایسی روشنی جو شاید صرف ان کے جیسے لوگوں کو ہی عطا ہوتی ہے جو اپنی ذات سے زیادہ دوسروں کے لیے جیتے ہیں۔ آنکھوں میں علم کی گہرائی، پیشانی پر تفکر کی نرم شکنیں، اور لبوں پر ہمیشہ ایک مدھم تبسم جیسے وہ دنیا کے دکھوں پر بھی مسکرا دینے کا ہنر رکھتے ہوں۔

ارمغان کے لباس میں سادگی اور نفاست دونوں کا رنگ ہوتا۔ سفید کوٹ، ہلکی خوشبو، اور گفتگو میں ایسا قرینہ کہ مریض کی نبض سے پہلے اس کے دل کا بوجھ ہلکا کر دیتے۔ اُن کی باتوں میں تاثیر تھی، اور انداز میں وہ نرمی جو کسی ماں کے لمس کی یاد دلاتی ہے۔

ان کا گھر، شہر کے ایک پوش علاقے میں واقع تھا، لیکن اس کی دیواروں پر غرور نہیں، شکر کے پھول کھلتے تھے۔ بیوی، ایک باوقار گھریلو خاتون، ہمیشہ ان کے پیچھے کھڑی رہیں — خاموش، مگر مضبوط۔ دو بچے، ایک بیٹا اور ایک بیٹی، اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے تھے، اور ان کے چال چلن سے لگتا تھا جیسے کسی مہذب گھونسلے کے پرندے پہلی اڑان کو تیار ہوں۔

ڈاکٹر ارمغان کی زندگی ایک مسلسل جدوجہد کی کہانی تھی — بچپن غربت کی دھند میں گم، جوانی محنت کے طوفان میں بھیگی ہوئی، اور بڑھاپا روشنی کی ایک قوسِ قزح بن کر افق پر چھا گیا۔ انھوں نے جو کچھ بھی حاصل کیا، وہ محض قابلیت سے نہیں، دیانت سے حاصل کیا۔ ان کی جائیدادیں، بنگلے، گاڑیاں — سب کچھ ان کی محنت کی روشن گواہی تھے، مگر ان کی اصل دولت لوگوں کی دعائیں تھیں۔

مریض جب اُن کے کلینک سے نکلتے، تو جیسے بیماری صرف جسم سے نہیں، روح سے بھی رخصت ہو جاتی۔ ان کا معائنہ صرف طبّی نہ ہوتا، روحانی بھی ہوتا — جیسے کوئی مصلح دل کو تسلی دیتا ہو، یا کوئی بزرگ دعا میں لپٹا حرف کہہ رہا ہو۔

ڈاکٹر ارمغان کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ اخبار میں اُن کے نام کی جھلک آ جائے، تو شہر کے کئی دل خوشی سے دھڑ کنے لگتے۔ ہر محلے میں کوئی نہ کوئی ایسا ضرور ہوتا جو کہتا، "ڈاکٹر صاحب نے مجھے نئی زندگی دی ہے۔"

لیکن وہ خود، ان سب باتوں سے بے نیاز، ایک درویش کی طرح زندگی بسر کرتے۔ ان کے رویّے میں عجز کا ایسا رنگ تھا جو بڑے بڑے علم برداروں کو شرمندہ کر دیتا۔ ان کی گفتگو میں جب کبھی "میں" آتا، تو وہ "ہم" بن جاتا۔

انہیں اپنے مریضوں کے نام یاد رہتے، ان کے دکھوں کا حساب رہتا، اور ہر سال عید پر وہ ضرورت مندوں کے گھروں میں خود جا کر تحفے پہنچاتے۔

اور اب، ان کا سب سے بڑا خواب حقیقت کا روپ دھارنے جا رہا تھا — ایک ایسا اسپتال جو صرف علاج گاہ نہیں، بلکہ انسانیت کی عبادت گاہ ہو۔ وہ بارہا کہتے، "یہ صرف میرا خواب نہیں، میرے والد کی آنکھوں کا چراغ ہے۔ اسے روشن رکھنا میری زندگی کا مقصد ہے۔"

ارمغان کے والد، حاجی کریم بخش، عمر کی سیڑھیاں اترتے اترتے اب جسمانی کمزوریوں کے نرم سائے میں تھے۔ مگر ان کی آنکھوں میں ایک عجیب سی روشنی تھی، جیسے برسوں پرانے کسی خواب کی کرن اب بھی پلکوں سے جھانک رہی ہو۔ وہ اُن بزرگوں میں سے تھے جن کے وجود سے گھر مہکتا ہے، اور جن کی خاموش دعائیں نسلوں کی تقدیر سنوار دیتی ہیں۔ چلتے تو لاٹھی کے سہارے، مگر ہر قدم میں استقامت کا عکس ہوتا۔ جسم کو کمزور ہو چکا تھا، مگر ذہن تر و تازہ اور دل حوصلے سے بھرا ہوا۔ اُنہیں اکثر کمر، جوڑوں، اور بلڈ پریشر کی شکایت رہتی، کبھی ذیابطیس کی خفیف شکایت بھی، مگر وہ ان سب بیماریوں کو ایسے جھیلتے جیسے موسم کی کوئی عارضی تبدیلی ہو۔

ان کا شمار اُس نسل میں ہوتا تھا جو کم بولتی تھی مگر بہت کچھ کہہ جاتی تھی۔ ان کی باتوں میں وقت کی گہرائی، اور رویّے میں مٹی کی خوشبو ہوتی۔ ان کے لیے عزت، حیا، اور خدمت، محض الفاظ نہیں تھے، وہ ایک تربیت، ایک طرزِ زیست تھے۔

ارمغان کے خواب کی بنیاد بھی دراصل انھی بزرگ ہاتھوں نے رکھی تھی۔ برسوں پہلے، جب ارمغان ایک چھوٹے سے گاؤں کے اسکول میں پڑھتا تھا، کریم بخش اکثر کہتے:

"بیٹا، زندگی میں دولت سے پہلے علم اور علم سے پہلے نیت کو سنوارو۔ ایک دن ایسا اسپتال بنانا جہاں لوگوں کا علاج صرف دواؤں سے نہیں، نرمی، سچائی اور دعا سے بھی ہو۔"

ارمغان نے یہ بات دل پر نقش کر لی تھی۔ آج جب وہ خواب ایک عمارت میں ڈھل چکا تھا، تو والد کی آنکھوں میں وہی

چمک تھی جو کسی زمیندار کو اپنے کھیت میں پہلی کونپل نکلتے وقت محسوس ہوتی ہے۔

خاندان کے باقی افراد بھی اسی مزاج کے آئینہ دار تھے — ماں وفات پا چکی تھیں، مگر ان کی دی ہوئی تربیت ہر فرد میں سانس لیتی تھی۔ ارمغان کے دو چھوٹے بھائی بیرونِ ملک مقیم تھے، مگر باقاعدگی سے والد کے ساتھ رابطے میں رہتے، اور ہر موقع پر حاضری دیتے۔ خاندان کی بیٹیاں علم و ادب کی روشنی سے مزین، اور شوہروں کے گھروں میں سلیقے اور خلوص کی مثال بنی ہوئی تھیں۔

کریم بخش کو جب اسپتال کی افتتاحی تقریب کی تاریخ دی گئی، تو وہ کئی دن تک خاموش رہے۔ پھر ایک شام، جب مغرب کی اذان کے بعد آسمان سنہری رنگوں میں بھیگا ہوا تھا، وہ آہستہ سے بولے،

"ارمغان بیٹا، میں چاہتا ہوں کہ اس اسپتال کا پہلا مریض میں ہوں... چاہے بطور مریض یا... متاعِ خاک۔ یہ عزت، یہ موقع، شاید کسی باپ کو دوبارہ نصیب نہ ہو۔"

ارمغان مسکرا دیے، آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔

"ابا جان، آپ کی موجودگی ہی میرے خواب کی تکمیل ہے۔ آپ پہلے مہمان ہوں گے، پہلے دُعائیہ کلمات کے امین، اور اگر تقدیر نے چاہا تو پہلے شفایاب بھی۔"

کریم بخش خاموشی سے مسکرا دیے، جیسے دل ہی دل میں دعا مانگ رہے ہوں کہ اگر اُن کا بیٹا روشنی کی عمارت بنا چکا ہے، تو وہ خود اُس کی پہلی روشنی بن جائیں۔

شہر اس دن عجیب ہنگامے اور وقار کا امتزاج بن چکا تھا۔ ہر طرف پوسٹر آویزاں تھے جن پر اسپتال کی خوبصورت عمارت، نیلے آسمان کے پس منظر میں ایستادہ، کسی خواب کا مجسمہ معلوم ہوتی تھی۔ سڑکوں پر ٹریفک قدرے سست تھی، جیسے خود وقت نے احتراماً اپنی رفتار تھام لی ہو۔ مقامی میڈیا کے نمائندے کیمرے لیے مختلف زاویوں سے عمارت کو قید کر رہے تھے۔ سیکیورٹی اہلکار اپنے مخصوص کانوں پر لگے آلات سے ہدایات سن رہے تھے۔ فضا میں پھولوں اور جراثیم کش اسپرے کی خوشبو ملی جلی سی مہک رہی تھی۔

اسپتال کے مرکزی دروازے پر ایک وسیع سرخ قالین بچھایا گیا تھا، جس کے دونوں جانب سفید اور نیلے غبارے قطار در قطار کھڑے تھے، جیسے دو عالم ایک دوسرے کو خوش آمدید کہہ رہے ہوں — خواب اور حقیقت۔

اس تقریب کے مہمانِ خصوصی صوبے کے وزیرِ اعلیٰ تھے، جن کے ساتھ کابینہ کے اراکین، اعلیٰ افسران، اور طبّی انجمنوں

کے سربراہ بھی موجود تھے۔ان کے علاوہ مشہور ڈاکٹرز، فلاحی اداروں کے نمائندے، علما، اور میڈیا شخصیات نے اس تقریب میں شرکت کی۔مگر سب سے اہم مہمان—حاجی کریم بخش—مرکزی اسٹیج پر، سبز مخملی صوفے پر تشریف فرما تھے۔ان کی سفید داڑھی، کلف زدہ کرتا، اور نگاہوں میں سکون کا چراغ، ایک ایسی شبیہہ بن چکے تھے جسے ہر کیمرہ محفوظ کرنا چاہتا تھا۔

اسٹیج پر بڑی سی کرسی کے پیچھے ایک تختی آویزاں تھی:

"کریم میڈیکل اینڈ ریسرچ سینٹر—ایک خواب کی تعبیر"

نیچے لان میں پُروقار تقریب شروع ہو چکی تھی۔تلاوت کے بعد تعریفی کلمات، پھر وزیرِ اعلیٰ کا خطاب۔ابھی چند ہی لمحوں میں ڈاکٹر ارمغان بھی تشریف لانے والے تھے—

اسی لمحے، دو ایمبولینسیں اسپتال کے عقبی دروازے پر رکیں۔پہلی ایمبولینس سے ایک نرس باہر نکلی، چہرے پر ہوائیاں، آنکھوں میں آنسو۔دوسری ایمبولینس سے ڈاکٹر ارمغان کا بیسدھ جسم اتارا گیا—چہرے پر سکون، جیسے کسی ان دیکھی دنیا میں افتتاح مکمل کر کے لوٹے ہوں۔

حیرت اور صدمے کا ایک گہرا سناٹا تقریب پر چھا گیا۔وزیرِ اعلیٰ خاموش کھڑے تھے۔اسپتال کا پہلا مریض... خود اس کا بانی، اس کا معمار، اس خواب کا مجاہد، جو محض لمحہ بھر پہلے آئینے کے سامنے اپنا کوٹ پہننے جا رہا تھا، اور سینے میں درد کی ایک لہر سب کچھ بدل گئی۔

کریم بخش خاموشی سے اپنی کرسی پر بیٹھے تھے، جیسے کسی عہد کے پورا ہونے کی گواہی دے رہے ہوں۔اُن کی آنکھیں بند تھیں... اور ہونٹ ہولے ہولے کچھ پڑھ رہے تھے—شاید ایک دعا... یا شاید ایک قبولیت۔

اور پھر اس ہسپتال سے جو پہلا جنازہ نکلا وہ ڈاکٹر ارمغان کریم کا تھا

سوال

پنجاب کے چھوٹے سے قصبے کی نیم خستہ گلی میں ایک نیم پختہ مکان تھا جس کے صحن میں بوڑھا جامن کا درخت خامشی سے ایستادہ تھا، گویا اپنے تنے پر گزرے ماہ وسال کی گرد سنبھالے بیٹھا ہو۔ اسی مکان میں رہتا تھا قربان خان، ایک معمولی سا سرکاری ملازم — محکمہ زراعت کا ایک چھوٹا افسر، جو ہر روز بوسیدہ فائلوں کے جنگل میں اپنی عمر گنواتا۔

قربان خان کی زندگی کا محور اس کا تین سالہ بیٹا ہارون تھا۔ وہ بچہ جس کی ماں، نائلہ، چند ماہ قبل ہی دنیا سے رخصت ہو چکی تھی۔ نائلہ، جو بیماری کی خاموش زد میں آ کر آہستہ آہستہ مٹی ہوگئی تھی، قربان خان کے وجود میں اب بھی ایک ہلکی سی آہٹ کی مانند زندہ تھی۔

نائلہ کا چہرہ یاد آتا تو قربان خان کے دل میں نمی کی کوئی پرانی تہہ جاگ اٹھتی۔ وہ صحن کے ایک کونے میں بچھی چارپائی پر ہارون کو لیے گھنٹوں بیٹھا رہتا، اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے ایک ہی بات سوچتا:

"یہ بچہ اب کس کو ماں کہے گا؟"

قربان خان کی طبیعت میں فطری ٹھہراؤ تھا۔ وہ کم بولتا، مگر جب بولتا تو جیسے لفظوں کے ہاتھ میں کبوتر ہوتے۔ نائلہ کی موت نے اسے اور بھی خاموش کر دیا تھا، لیکن ہارون کی معصوم آواز اس کی خامشی کو سہارا دیتی۔

ہارون اپنی عمر سے کہیں زیادہ بولنے والا بچہ تھا۔ وہ اکثر کھلونوں سے کھیلتے ہوئے اچانک رک جاتا، اور کسی بے ربط سوال کی پٹاری کھول دیتا:

"بابا، آسمان نیلا کیوں ہوتا ہے؟"

"بابا، بارش کے قطرے زمین پر گر کر کیوں ٹوٹتے ہیں؟"

"یہ بلی ہمیں کیوں گھورتی ہے؟"

اور قربان خان ان سوالات کے جواب کچھ سائنسی، کچھ خیالی، کچھ محض کہانی کی شکل میں دیتا رہتا۔ وہ سمجھتا تھا کہ بچے کی تخلیق میں سوالوں کی مٹی ہوتی ہے۔

نائلہ کی آخری رسومات کے بعد قربان خان کے گھر والے چاہتے تھے کہ وہ دوسری شادی کر لے۔ ماں، بہنیں، یہاں تک کہ دفتر کے کچھ دوست بھی یہی مشورہ دیتے رہے۔ لیکن قربان خان کی نگاہوں میں ہارون کا وہ چہرہ تھا جو اپنی ماں کو پکار پکار کر خاموش ہو گیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کوئی اور عورت، ماں کی گود نہیں بن سکتی۔ وہ اپنے بچے کے ساتھ ایک نئی زندگی شروع کرنا چاہتا تھا، بغیر کسی بوجھ یا مداخلت کے۔

نائلہ کے فراق کے بعد قربان خان کے اندر جیسے کوئی نرم سا خالی پن پھیل گیا تھا۔ قریبی رشتہ دار مسلسل اسے قائل کرنے کی کوشش کرتے رہے کہ "بچے کی پرورش کے لیے عورت کا ہونا ضروری ہے"، لیکن قربان خان جانتا تھا کہ بعض اوقات محض موجودگی، ماں نہیں بن سکتی۔ دل سے فیصلہ کیا کہ وہ دوسری شادی نہیں کرے گا۔ اس نے شہر کے گنجان ماحول کو خیر باد کہا اور ایک دور دراز قصبے کا رُخ کیا۔

یہ قصبہ سبزہ زاروں، پرانے پیپل کے درختوں، اور ہلکی دھیمی بولی کی زمین تھا۔ وہاں وقت کچھ آہستہ چلتا تھا، جیسے کسی بوڑھے شاعر کے کلام کی روانی میں۔ قربان خان کو یہاں ایک چھوٹا سا کرایہ کا مکان مل گیا — دو کمروں پر مشتمل، جس کے صحن میں اک شگوفہ دار درخت موجود تھا، جو دن بھر میں چھاؤں کی مختلف صورتیں بدلتا رہتا تھا۔

اس قصبہ میں تبادلہ کرا کے قربان خان نے نئی ذمہ داریاں سنبھال لیں۔ اب اس کی صبح فجر کی اذان سے شروع ہوتی، جب وہ ہارون کو چوم کر اُٹھتا، ناشتہ تیار کرتا، اور اسے ایک بوڑھی عورت کے سپرد کرتا، جو ہمسائیگی میں رہتی تھی۔ بی بی حلیمہ، جو کبھی نرس رہ چکی تھی، اب بڑھاپے میں بچوں کی نگہداشت کا کام کرتی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں مٹی کی خوشبو اور لہجے میں ماں کی سی گرمی تھی۔

قربان خان کو اکثر دفتر سے واپسی پر تھکن محسوس ہوتی، مگر ہارون کا وجود اس کی ساری تھکن ختم کر دیتا۔ شاموں کو وہ دونوں صحن میں بیٹھ جاتے۔ قربان خان کبھی ہارون کو کہانیاں سناتا، کبھی اس کے سوالوں کی لڑی میں الجھ جاتا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ لمحات عارضی ہیں — کل کو ہارون بڑا ہو جائے گا، اور یہ سوالات، یہ ضدیں، یہ بے تکے قہقہے سب ماضی کی فصیل

کے پار اتر جائیں گے۔

اس دوران قربان خان نے اپنے آپ کو سنوارنے کی کوشش بھی کی۔ وہ خود کھانا پکانا سیکھ گیا، کپڑے دھونا، استری کرنا، ہارون کو اسکول لے جانا اور واپس لانا، دوا دینا، اور رات کو لوری سنانا — یہ سب اب اس کی زندگی کا معمول بن چکے تھے۔

رات کو جب سناٹا پھیلتا، اور دور مسجد کی منڈیروں سے صدائیں گونجتیں، تو قربان خان اکثر اپنی تنہائی کے صحراؤں میں گم ہو جاتا۔ وہ جانتا تھا کہ اس نے ایک بڑا فیصلہ کیا ہے، اور ہر بڑے فیصلے کے بدلے، تقدیر کچھ چھوٹے سکھ چھین لیتی ہے۔

ایک رات سیاہی نے کھڑکیوں پر دستک دے رہی تھی، کمرے میں زرد بلب کی مدھم روشنی ماحول کو نیند آلود کر رہی تھی۔ کمرے کی ایک چارپائی پر والد نیم دراز، گردن دیوار سے ٹکائے آنکھیں بند کیے بیٹھے تھے۔ چارپائی کے دوسرے کنارے پر چھوٹا سا بچہ کمبل میں لپٹا کروٹیں بدل رہا تھا۔

"بابا؟"

"ہوں؟"

بابا، چاند کیوں ہمارے ساتھ بھاگتا ہے جب ہم گاڑی میں ہوتے ہیں؟"

وہ تو تمہیں لگتا ہے بیٹا، اصل میں ہم ہی تیز بھاگ رہے ہوتے ہیں۔ چاند تو ویسے ہی اپنے راستے پر چلتا ہے، صدیوں سے۔

"تو کیا چاند بھی تھک جاتا ہے کبھی؟"

"چاند؟ نہیں، وہ تو بس چپ چاپ چمکتا رہتا ہے، جیسے ماں راتوں کو جاگتی تھی تمہارے بخار میں، کچھ کہے بغیر۔"

"بابا؟"

"جی بیٹا؟"

" کیا ستارے ہم سے بات کرتے ہیں؟"

"ہاں، کرتے ہیں۔ جب ہم خاموش ہو جائیں، دل کی زبان میں۔"

"اچھا! پھر وہ کیا کہتے ہیں؟"

"وہ کہتے ہیں کہ نیند میں خواب دیکھنا، جاگتے ہوئے ان کو پورا کرنا"

"بابا، اگر میں چاند پہ جاؤں، تو آپ میرے ساتھ آئیں گے؟"

"ضرور، میں تو تمہارے ساتھ زمین کے نیچے بھی جا سکتا ہوں، چاند تو بہت دور بھی نہیں۔"

"بابا، اگر میں اڑنے لگوں تو آپ میرا ہاتھ پکڑیں گے؟"

" پکڑوں گا بھی اور چھوڑوں گا بھی۔ جب تم اڑنا سیکھ لو، تب ہاتھ چھوٹنے میں ہی محبت ہوتی ہے۔"

"بابا، آپ اتنی عجیب باتیں کرتے ہیں"!

"یہی تو تم نے مجھ سے سیکھی ہیں۔"

"بابا، آپ جب چھوٹے تھے تو کتنے دوست تھے آپ کے؟"

"ایک تھا، آم کے درخت کے نیچے بیٹھتا تھا، ہم دونوں گھنٹوں باتیں کرتے۔"

" کیا وہ درخت اب بھی ہے؟"

" نہیں بیٹا، وہ وقت کے ساتھ زمین میں سو گیا، جیسے لوگ سوتے ہیں... ہمیشہ کے لیے۔"

"بابا، موت کی نیند کیسی ہوتی ہے؟"

"بالکل ویسی جیسے ماں کی گود میں نیند آتی تھی... محفوظ، خاموش، اور نرم۔"

"بابا، جب میں بڑا ہو جاؤں گا، تو آپ کہاں ہوں گے؟"

"تمہارے دل میں، تمہارے سائے میں، تمہارے خوابوں میں۔"

"بابا، آپ کہیں نہ جانا، ٹھیک ہے؟"

"وعدہ کرتا ہوں، جب تک تم مجھ سے بات کرو گے، میں تمہارے پاس رہوں گا۔"

"بابا، آپ مجھ سے سوال کیوں نہیں کرتے؟"

"اچھا... اگر میں تم سے سوال کروں تو تم جواب دو گے؟"

"ہاں، بالکل! جیسے آپ میرے سوالوں کے جواب دیتے ہو۔"

"تو بتاؤ بیٹا، جب تم بڑے ہو جاؤ گے، اور میں چھوٹا ہو جاؤں گا... کیا تب بھی تم میرے سوالوں کے جواب دو گے؟"

"بابا! آپ بڑے ہو کر کیسے چھوٹے ہو سکتے ہیں؟"

"جیسے تم بڑے ہو کر سب کچھ بھول جاتے ہو، ویسے ہی میں چھوٹا ہو کر سب کچھ یاد رکھتا ہوں۔"

"اوہ! عجیب بات ہے"...

"پھر بھی وعدہ کرو، جواب دو گے؟"

"ہاں بابا، میں وعدہ کرتا ہوں۔ جب آپ سوال کرو گے، میں آپ کو ایسے ہی جواب دوں گا جیسے آپ مجھے دیتے ہو۔"

تو پوچھوں؟

ہاں بابا!

"بیٹا؟"

"جی، بابا؟"

"یہ... جو چھوٹے چھوٹے پرندے چھت پہ چہچہاتے ہیں، ان کے پاس بھی گھڑی ہوتی ہے کیا؟"

"نہیں بابا، ان کے اندر گھڑی ہوتی ہے... وقت کا اندازہ قدرت نے سکھایا ہوتا ہے۔"

"اچھا... لیکن جب میں تیری عمر کا تھا، تو ان کی بولی سمجھ آتی تھی مجھے۔ اب تو سب شور لگتا ہے۔"

"وہ اس لیے بابا، کہ تب دل سنتا تھا، اب دماغ سننے لگا ہے۔"

"ہاں، دماغ تو اب آہستہ آہستہ تھکنے لگا ہے... جیسے کسی پرانی مشین میں زنگ لگ جائے۔"

"بابا، آپ پھر وہی پرانی باتیں لے بیٹھے۔ تھوڑی دیر آرام کر لیں، آپ کے لیے دودھ بھی ٹھنڈا ہو گیا ہے۔"

"ارے وہ دودھ تو اب ویسا نہیں لگتا جیسے تیری ماں بنایا کرتی تھی۔ وہ تو چولہے پہ رکھا رہتا اور خوشبو آتی رہتی تھی"...

"بابا، اُس زمانے میں چولہا بھی اور ہوتا تھا، اور وقت بھی۔ اب تو وقت بھاگ رہا ہے، سب کچھ بھاپ کی طرح اڑتا جا رہا ہے۔"

"بھاگتا وقت... ہاں، میں بھی تو اب چلتا ہوں، دو دو بار سیڑھیوں پر ٹھوکر لگتی ہے۔ وہ جو کمر کی ہڈی ہے، وہ جیسے بولتی ہے: 'بس کرو''!

"بابا، میں کہتا ہوں، آپ نیچے والے کمرے میں رہ لیں، سیڑھیاں نہ چڑھا کریں۔"

"نہیں بیٹا، میں تو اوپر ہی رہوں گا۔ اُس کھڑکی سے دریا دکھائی دیتا ہے نا... وہ مجھے تمہاری ماں کی آواز جیسا لگتا ہے۔"

"بابا... آپ اکثر امی کی باتیں کرتے ہو۔"

" کیوں نہ کروں؟ جس نے میرے جوان دنوں کو مہکایا، اس کی خوشبو اب بھی دل میں بسی ہے۔ تمہیں کیا پتا، وہ کیسے دن تھے"...

"بابا... بس کریں، دل دکھتا ہے سن کر۔" اب آپ سو جائیں

"بیٹا، ایک بات کہوں؟"

"جی بابا؟"

"بیٹا، کیا وقت تھک جاتا ہے؟"

" کبھی کبھی۔"

"تو پھر لوگ بھی تھک جاتے ہیں۔ میں... تھک گیا ہوں شاید۔"

"بابا، آپ اداس لگتے ہو۔"

" نہیں، بس آج دل چاہا تم سے تھوڑا بات کروں۔"

"بابا، آپ آرام کریں۔ صبح دوا بھی لینی ہے آپ کو۔"

"ہاں... دوا۔ عجیب لفظ ہے۔ جوانی میں دوا ماں دیتی تھی، اب بیٹا دیتا ہے۔ فرق صرف اس بات کا ہے کہ ماں کی دوا میں دعا بھی شامل ہوتی تھی۔"

"بابا... آپ سو جایئے، صبح بات کریں گے۔"

"بیٹا؟"

"جی؟"

"اگر میں کچھ پوچھوں تو تم ناراض تو نہیں ہو گے؟"

"بابا، سو جایئے۔" خدا کے لیے سو جایئے، میں بہت تھکا ہوا ہوں، ایک تو فیکٹری میں بہت کام ہوتا ہے، پھر گھر آ کر بچوں کے مسائل، گھر کے کام، پھر رات کو آپ نہیں سونے دیتے۔

" ٹھیک ہے بیٹا۔" میں سو جاتا ہوں، آپ تھکے ہوئے ہوتے ہو، ہاں میں سو جاتا ہوں۔

میں سو جاتا ہوں، بیٹا!

میں سو جاتا ہوں۔۔۔۔

"بابا؟ سو گئے؟"

"بابا۔۔۔؟؟"

بابا۔۔۔؟؟؟

خواب وخیال

ایک نسبتاً چھوٹے، مگر تہذیب یافتہ شہر کی گلیوں میں وہ گھر ایک زرد گلاب کی مانند کِھلتا تھا—نہ بہت بڑا، نہ چھوٹا، مگر جتنا بھی تھا، سلیقے سے سجا ہوا، صاف ستھرا، جیسے کسی نے محبت سے تھاما ہوا اور ہوا کے جھونکوں سے محفوظ رکھا ہو۔ باہر کے صحن میں لگے نیم کے درخت کی چھاؤں تلے بچھی پرانی کرسی پر اکثر ابّا جی اخبار بغل میں دبائے بیٹھے ملتے، اور دروازے کے ساتھ لگی بیل کا پھول جب کھلتا تو لگتا جیسے کوئی چھوٹی سی خوشی دروازے پر مسکرا رہی ہو۔

یہ گھر، جہاں زندگی اپنی اصل روح کے ساتھ سانس لیتی تھی، ایک متوسط طبقے کی تعلیم یافتہ اور باوقار فیملی کا مسکن تھا۔ ابّا جی، ریٹائرڈ لیکچرر، اردو زبان کے شیدائی، اور اماں، نہایت سلیقہ شعار، دیندار اور نرمی میں لپٹی ہوئی ایک ماں، جس کی گود میں اولاد کی تربیت گویا عبادت کی صورت تھی۔

پانچ بچوں کا یہ گھرانا اپنی عددی چھوٹائی میں محبت کی وسعت رکھتا تھا—دو بیٹیاں اور تین بیٹے۔ بڑی بیٹی نورین، بی اے پاس، نرم گو، سادہ مزاج، اور خدوخال میں وہ نفاست جو فطرت میں نرمی سے آتی ہے۔ چھوٹی بہن عروج، ابھی ایف ایس سی میں، شرارتی مگر ذہین، اکثر اپنی بڑی بہن کو چھیڑتی رہتی۔ تینوں بھائیوں میں بڑا بھائی سلمان لاہور میں نوکری کرتا تھا، درمیانہ عثمان ابھی یونیورسٹی میں، اور سب سے چھوٹا فیضان میٹرک میں۔

یہ گھر محبت کے اصولوں پر قائم تھا۔ یہاں شام کو سب دسترخوان پر جمع ہوتے، کوئی اخبار سناتا، کوئی سبق دہراتا، اور اکثر نورین اماں کے ساتھ مل کر سالن میں نمک کا اندازہ لگاتی۔ اس گھر کی دیواروں میں قہقہے بکھرے تھے، اور خواب آنکھوں میں چمکتے تھے۔

نورین اب اٹھائیس برس کی ہو چلی تھی، اس کی شادی کے لیے کئی رشتے آئے، مگر کسی نہ کسی وجہ سے بات بنی نہیں۔ اماں اکثر تسبیح کے دانے گراتے ہوئے کہتیں، "جورب کی مرضی، وہی بہتر۔" نورین اب خاموش ہو گئی تھی، جیسے زندگی نے اس کی باتوں کو آہستہ کر دیا ہو۔ لیکن اس کی آنکھوں میں اب بھی وہ امید کا دریچہ روشن تھا، جسے وقت دھندلا نہ کر سکا۔

یہی خاموشی ایک روز اُس لمحے میں بدل گئی جب ابّا جی کو ایک پرانا شناسا ملا، جو کسی عزیز کے رشتے کی بات کر رہا تھا۔ وہ لوگ کچھ اونچے طبقے کے، مگر شریف اور تعلیم یافتہ سمجھے جاتے تھے۔ اماں کے چہرے پر دیر بعد وہی پرانی چمک لوٹ آئی، اور نورین کی آنکھوں میں ایک انجانی جھجک کے ساتھ جھلملاتی ہوئی امید نے جھانکا۔

وہ دن جیسے ہوا میں نرمی لے آیا، اور ہر شخص نے اپنے اپنے طور پر کسی نئی شروعات کا ساماں محسوس کیا۔ گھر میں ہلکی ہلکی تیاری کا شور، اماں کی ہدایات، عروج کی شرارتیں، اور نورین کا گہری سوچوں میں کھو جانا — سب مل کر بتا رہے تھے کہ زندگی شاید ایک موڑ پر ہے۔

وہ لوگ جو رشتہ لے کر آ رہے تھے، دراصل نورین کے ابّا جی کے ننہال سے تھے۔ برسوں پہلے رشتے داری کے دھاگے دھندلا گئے تھے، مگر ایک تقریب میں ملاقات نے جیسے ماضی کے ورق پھر سے کھول دیے تھے۔

یہ خاندان اب بڑے شہر میں آباد تھا — عیش و آرام، تعلیم، کاروبار، اور سماجی حیثیت میں وہ نورین کے خاندان سے کچھ قدم آگے تھے۔ ان کا رہن سہن ذرا نفیس اور جدید طرز کا تھا، مگر گفتگو میں شائستگی اور طرزِ تکلم میں تربیت جھلکتی تھی۔

سب سے اہم شخصیت اس خاندان میں عدنان تھا — وہی لڑکا جس کے لیے رشتے کی بات کی جا رہی تھی۔

عدنان نے انجینئرنگ کی تعلیم کے بعد ایک بین الاقوامی فرم میں نوکری اختیار کی تھی۔ دراز قد، سانولی رنگت، پیشانی پر ہلکی سی شکن جیسے سوچنے کا عادی ہو، اور آنکھوں میں ایک سنجیدہ چمک۔

اس کی طبیعت میں کچھ خاموشی، کچھ سنجیدگی، اور کچھ ایسا وقار تھا جو عمر سے بڑا لگتا تھا۔

عدنان کے دوست کہتے تھے کہ وہ بہت ذمہ دار اور مہذب انسان ہے، مگر کچھ لوگ اسے "زیادہ محتاط" اور "تنہائی پسند" بھی کہتے تھے۔

اس کے والد، ریاض صاحب، ایک ریٹائرڈ سرکاری افسر تھے — صاف گو، مختصر گفتگو کے قائل، اور ہر بات میں اصولوں کی بات کرنے والے۔

والدہ شفقت بیگم، خوش لباس، خوش اخلاق، اور شُستہ اردو بولنے والی خاتون تھیں، جن کے لہجے میں مٹھاس اور انداز

میں نرمی تھی۔

عدنان کی ایک بڑی بہن شادی شدہ تھی، جو گاہے بگاہے والدین کے گھر آتی تو ماں کا ہاتھ بٹاتی۔ گھر میں ماحول اچھا تھا، مگر کچھ "روایت پسندی" کی چھاپ اب بھی تھی، جس کا ذکر کئی رشتہ داروں نے غیر محسوس انداز میں کیا۔

ریاض صاحب کے خاندان کی خوبی یہ تھی کہ وہ رشتوں کو سمجھتے اور نبھاتے تھے، مگر ان کے ہاں معیار کی بھی ایک لکیر تھی۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ بہو تعلیم یافتہ، با اخلاق، اور گھریلو ہو — ایسی جو زمانے کے رنگ میں رنگی ہوئی نہ ہو، مگر بالکل مدھم بھی نہ ہو۔

عدنان خود شادی کے حق میں خاص سرگرم نہ تھا، مگر ماں کی خواہش پر آمادہ ہوا۔

شفقت بیگم کو نورین کی تصویر اور تعلیمی پس منظر پسند آیا، اور خاص طور پر اماں کی گفتگو نے اُن کے دل میں کچھ نرمی پیدا کر دی۔ وہ کہنے لگیں، "لڑکی کی تربیت ماں کی زبان سے جھلکتی ہے۔"

یوں بات کچھ آگے بڑھی، اور طے پایا کہ اگلے ہفتے وہ سب نورین کو دیکھنے کے لیے آئیں گے۔

خبر جیسے گھر میں خوشبو کی مانند پھیل گئی۔ نورین خاموش تھی، مگر اس کی نظریں دیوار کے ایک کونے میں جمی تھیں، جیسے کوئی پرانا خواب دوبارہ جاگا ہو۔

اب اماں کے ہاتھوں میں پھر چوڑیاں چھنکنے لگیں، اور عروج نے تو جیسے ڈائری میں "کزن عدنان" کے فرضی نام سے کچھ سطریں بھی لکھ ڈالیں۔

گھر کی فضا ہلکے ہلکے بدلنے لگی تھی — چائے کی خوشبو میں اب ہلکی سی امید گھلنے لگی تھی۔

مہمان آ گئے، ہلکی پھلکی گفت گو کے بعد معاملات طے پا گئے۔ دن طے ہوئے اور شادی ہو گئی۔

ڈھولک کی آوازیں ابھی بھی ذہن میں بازگشت کر رہی تھیں۔ مہمانوں کی ہنسی، پھولوں کی خوشبو، چمکتے جوڑے، چمچماتی گاڑیاں — سب کچھ خواب سا، مگر حقیقی لگتا تھا۔ عدنان کے ساتھ رخصتی ہوئی، اور وہ اسے نئے گھر لے آیا۔

نیا گھر — ایک کشادہ بنگلہ، قیمتی فرنیچر، پردوں پر جھلملاہٹ، اور دیواروں پر سلیقے سے لگی ہوئی تصاویر۔ سب کچھ اچھا تھا، مگر عجیب سی اجنبیت تھی، جیسے کوئی دریا کنارے کھڑا ہو اور پانی سے کچھ نہ مانوس ہو۔

عدنان خاموش تھا، ہر وقت کسی نہ کسی کام میں مصروف۔ دفتر کے بہانے، فون کالز، میٹنگز — گفتگو میں نرمی تو تھی، مگر قربت کا لمس نہیں تھا۔

نورین اکثر کوشش کرتی کہ کچھ بات کرے، ہنسے، کوئی پرانی بات یاد کرے، مگر عدنان کی آنکھوں میں جیسے دھند اتر آئی ہو۔

کئی مہینے گزر گئے۔ نورین کے لباس بدلے، چہرے کا نکھار مدھم ہوا، آنکھوں کی چمک دھیرے دھیرے بجھنے لگی۔

عدنان کی ماں نرم لہجے میں مگر صاف الفاظ میں کہتی:

"اب تھوڑا سنبھالنا سیکھو، بیوی ہو، کوئی مہمان نہیں۔"

ایک شام، جب سب کچھ برداشت کی حد پار کر چکا تھا، عدنان نے محض نمک کم ہونے پر غصے میں تھالی پھینک دی۔

نورین سہم کر ایک طرف ہوگئی۔

پہلی بار عدنان کا ہاتھ اس کے کندھے سے ٹکرایا — یہ تھپڑ نہ تھا، مگر تھپڑ سے کم بھی نہیں تھا۔

اس لمحے کمرہ جیسے لرز گیا۔ دیوار پر لگی تصویر کج ہوگئی۔

نورین کی آنکھوں سے آنسو نکلے، مگر زبان خاموش رہی۔

اسے یاد آیا، اماں نے کہا تھا: کہ۔۔۔۔

تب ہی، ایک تیز دھار روشنی چمکی اور وہ چونک کر اُٹھی۔

آنکھیں کھولیں تو۔۔۔۔۔

یہ سب... خواب تھا؟

دل ابھی بھی دھڑک رہا تھا، ماتھے پر پسینہ، اور جسم پر کپکپی۔

اگلے لمحے اماں کی آواز آئی:

"نورین بیٹا، اُٹھ جا، مہمان آنے والے ہیں، تیار ہو جا ذرا۔"

نورین نے آنکھیں بند کیں، گہرا سانس لیا، اور زیرِ لب کہا:

"شکر ہے، یہ تو خواب تھا"...

مہمانوں کی آمد کی خبر سن کر نورین نے جلدی سے خود کو آئینے کے سامنے سنوارنا شروع کیا۔ ہلکی سی گلابی فراک، جس پر سفید زری کا کام تھا، وہی جو ابا نے خاص اس کے لیے لاہور سے منگوائی تھی۔ ہاتھوں میں چوڑیاں، جن کی کھنک کسی بھولی بسری امید کی طرح دل کو چھو رہی تھی۔

ڈرائنگ روم مہک رہا تھا۔اماں نے صوفوں پر نئی چادریں بچھوائی تھیں،فرش پر قالین دھو کر بچھایا گیا تھا،اور کونے میں رکھا گلدان تازہ گلابوں سے سجا تھا۔

جیسے ہی وہ لوگ آئے گھر میں ہلکی سی کھسر پھسر پھیل گئی۔

ابا نے بڑی گرمجوشی سے ان کا استقبال کیا۔

عدنان—جی ہاں، وہی عدنان— مہمانوں کے ساتھ آیا۔وہ وجیہہ تھا،شائستہ،نظریں نیچی،گفتگو میں ادب۔

نورین ڈائنگ روم کے پردے کے پیچھے بیٹھی سب کچھ دیکھ رہی تھی۔

لڑکے والے بہت مہذب لوگ تھے۔انہوں نے کوئی شرط نہیں رکھی کوئی مطالبہ نہیں کیا،خان دان ایک دوسرے کو پہلے ہی جانتے تھے،تمام معاملات بغیر کسی رکاوٹ کے طے پا گئے اور شادی ہوگئی۔

نئے گھر کا منظر خواب جیسا ہی تھا۔گھر میں خوشیوں کا بسیرا تھا،عدنان کی ماں نے گلے لگا کر کہا:

"بیٹی،اب یہ تیرا گھر ہے۔"

عدنان کے ابو نے مسکرا کر کہا:

"ہم نے بیٹا تو پال رکھا تھا،مگر بیٹی آج ملی۔"

عدنان ہر شام دفتر سے آتے ہی نورین کو وقت دیتا۔وہ اکثر اسے حیران کن انداز میں گھورتی اور ہنس کر کہتی:

"میں نے نا،شادی سے پہلے ایک خواب دیکھا تھا"...

عدنان مسکرا کر پوچھتا:

" کیسا خواب؟"

"بس ایک ایسا خواب کہ تم... تم اچھے نہ تھے"...

عدنان زور سے ہنس کر کہتا:

"پھر تو میں خواب میں ہی برا ہوں گا،حقیقت میں تو دیکھ لو"!

اور وہ دونوں ہنس پڑتے۔

سفر پر نکلنا عدنان کی عادت تھی۔کبھی ایک تفریحی مقام،کبھی دوسرا،کبھی کوئی اور۔پہاڑوں کے درمیان وہ دونوں ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے چلتے،اور نورین بار بار کہتی:

"پتہ ہے، تم ان خوابوں سے کہیں بہتر ہو"!

وقت جیسے پر لگا کر اُڑتا گیا۔ مہینے سالوں میں بدل گئے۔ نورین کی ہنسی، جو کبھی آئینے سے چھپی رہتی تھی، اب بے ساختہ چھلکنے لگی تھی۔

ایک دن عدنان کے پورے خاندان کے ساتھ وہ میکے آئی۔ ابا نے وہی چائے بنائی، اماں نے وہی چینی کی پلیٹیں نکالیں، اور سب ویسے ہی صوفوں پر بیٹھے جیسے اس دن، جب رشتہ لانے آئے تھے۔

عدنان کی ماں، جواب "اماں جی" بن چکی تھی، اپنے کپڑوں کی کریز ٹھیک کرتے ہوئے مسکرائیں، اور نورین کی ماں سے کہا:

"باجی، وہ بات تو رہ ہی گئی... ہم تو اصل میں آپ کی چھوٹی بیٹی کے لیے رشتہ لائے تھے۔

کمرے میں جیسے ہنسی کی جگہ سنّاٹا آ گیا۔

نورین کی آنکھیں پھیلی، لب کپکپائے، اور دل میں ایک تیز دھک کی آواز آئی۔

مگر بہن جی ہم نے نورین کی شادی کرنی ہے۔۔۔۔

وہ بھی ہو جائے گی، آپ ابھی عروج کا رشتہ طے کر دیں، شادی چاہے تب کر لیجئے گا جب نورین کا کوئی مناسب رشتہ مل گیا۔ ہمیں بھی ابھی کوئی جلدی نہیں ہے۔۔۔۔

نورین ڈائنگ روم کے پردے کے پیچھے بیٹھی سب کچھ سن رہی تھی۔

اکسیر

بیسویں صدی کی ابتدائی دھندلی صبحوں میں، جب زمانہ ترقی کے خواب دیکھنے لگا تھا، تب بھی کچھ شہر ایسے تھے جن پر وقت کی رفتار جیسے مہربان تھی۔ ایسا ہی ایک شہر تھا، نیم معروف، نیم گمنام، پہاڑی دامن میں بسا، جس کے گلی کوچے علم و تہذیب سے آشنا تھے اور فضائیں مہذب انسانوں کی گفتگو سے گونجتی تھیں۔ یہاں لوگ سلام کو ہاتھ دل پر لے جاتے، رات کے وقت دروازے بند کرنے سے پہلے ہمسایوں کی خیریت دریافت کرتے، اور بزرگوں کی مسکراہٹ میں اپنے کل کی جھلک دیکھتے۔

اسی شہر کے قلب میں ایک قدیم طرز کی کوٹھی تھی، جس کی سفید دیواریں، کشادہ برآمدے اور دیسی خوشبو سے بسا باورچی خانہ ایک مکمل دنیا معلوم ہوتا تھا۔ اس گھر میں رہنے والے خاندان کی شرافت اور نجابت پورے شہر میں زبان زدِ عام تھی۔ والد، ایک عالمِ دین اور ادیب؛ والدہ، سراپا مروت و محبت؛ بہنیں تعلیم یافتہ اور پردہ دار، اور بھائی شائستہ، باادب اور نرم گفتار۔

خاندان کی سب سے روشن کرن اُس کا بڑا بیٹا، ڈاکٹر سعید نقوی تھا، جس کی طبی قابلیت، اخلاقی وجاہت اور شرافت کا شہر میں ثانی نہ تھا۔ یہ خاندان علم و عمل، محبت و قربانی اور تہذیب و تمدن کی علامت تھا۔ ان کے ہاں شام کی چائے صرف پینے کی نہیں، سننے، سمجھنے اور جڑنے کا ایک ذوق تھی۔ ہر جمعرات کو بیٹھک میں ہونے والی گفتگو میں سائنسی موضوعات اور روحانی مباحث پہلو بہ پہلو چلتے۔

شہر کے لوگ کہتے تھے: "نقوی خاندان وہ چراغ ہے جو نہ صرف اپنے آنگن کو، بلکہ پورے محلے کو روشن کرتا ہے۔"

ڈاکٹر سعید نقوی، اپنی جوانی میں ہی علم کا دیوانہ تھا۔ طب، نباتات، کیمیا اور فزیالوجی —— سبھی اس کے ذہن کے دریچوں میں یکساں اہمیت رکھتے تھے۔ اس کی آنکھوں میں سچائی کی چمک تھی، اور ہاتھوں میں شفا کا ہنر۔ اس کا مطب چھوٹا سا تھا، مگر وہ مطب نہیں، ایک مزار تھا، جہاں دردمند دل دوا سے پہلے دعا لینے آتے۔

اس کی گفتگو میں فلسفہ، مزاج میں متانت، اور لباس میں سادگی تھی۔ مریض اس کے لمس میں ماں کی شفقت محسوس کرتے، اور شاگرد اس کی نگاہ میں ایک ایسے استاد کا عکس دیکھتے جس کا ہر لفظ گویا کسی عہد کا اعلان ہوتا۔ وہ اکثر کہتا، "زندگی ایک نعمت ہے، اور ہر سانس ایک امانت۔" یہی یقین اس کی طبی خدمات کی بنیاد تھا۔

اس کی بیوی، فاطمہ، ایک سلجھی ہوئی، ذہین خاتون تھی، جو نہ صرف شریکِ حیات بلکہ شریکِ فکر بھی تھی۔ اُن کے درمیان صرف رفاقت نہیں، ایک علمی مکالمہ بھی جاری رہتا۔ جب فاطمہ چائے پیش کرتی تو سعید کسی سائنسی مقالے کا حوالہ دیتے دیتے، اُس کے ہاتھوں کو تھام کر کہتا، "اگر زندگی بڑھائی جا سکتی، تو میں تمہیں ہمیشہ کے لیے اپنے ساتھ رکھ لیتا۔"

ماں باپ بوڑھے ہو چکے تھے، مگر سعید کی نظر میں وہ اب بھی اپنے بچپن کی مسکراہٹ تھے۔ وہ اکثر سوچتا، اگر وقت کو کچھ دیر کے لیے روکا جا سکتا، اگر عمر کو ذرا تھمایا جا سکتا... مگر یہ خیال فقط اک خواہش بن کر رہ جاتا۔ یا شاید نہیں۔

ایک سرد رات، جب فاطمہ کو بخار تھا اور والد کی سانسیں کمزور ہو رہی تھیں، سعید اپنی مطب کی میز پر جھکا ہوا، ایک پرانے کیمیائی نسخے کا مطالعہ کر رہا تھا۔ اچانک ایک خیال بجلی کی مانند اس کے ذہن میں کوندا: "کیا موت کو روکا جا سکتا ہے؟ کیا کوئی ایسا مرکب، کوئی ایسا محلول، کوئی ایسی دوا ممکن ہے جو عمر کو طول دے سکے؟"

یہ سوال نیا نہیں تھا۔ فلسفہ، تصوف، اور سائنس —— سب نے اس پر غور کیا تھا۔ مگر سعید ایک طبیب تھا، اور اس کے سامنے جذبات کی نہیں، ترکیب کی دنیا تھی۔ وہ دلیل سے سوچتا، تجربے سے پرکھتا۔

اس نے اپنے دل کو دو پلڑوں میں بانٹ دیا: ایک طرف سائنس، دوسری طرف اخلاق۔ وہ خود سے مخاطب ہوا: "اگر ایسی دوا ممکن ہو، تو کیا انسان خدا بننے کی جسارت نہیں کرے گا؟" "اگر موت کا وقت بڑھا دیا جائے، تو کیا اس زمین پر ظلم اور لالچ نہ بڑھ جائیں گے؟"

پھر ایک اور آواز اس کے دل سے ابھری: "مگر اگر میں صرف اپنے ماں باپ، اپنی بیوی، اپنی بہنوں کے لیے چند سال اور خرید سکوں؟ چند موسم؟ چند صبحیں؟"

یہ جذبہ، یہ محبت، یہ عقیدت، آخر کار اس کے شک کو دبا گئی۔ اس نے فیصلہ کرلیا کہ وہ اس راہ پر چلے گا، چاہے کوئی ساتھ دے یا نہ دے۔

جب ڈاکٹر سعید نے اپنے تجربات کا آغاز کیا تو ابتدا میں شہر کے چند محققین نے اس کا ساتھ دیا، مگر جلد ہی اس کی تحقیق کو "بغاوتِ فطرت" قرار دے کر سب الگ ہو گئے۔ مگر سعید نہ رکا، نہ تھکا۔ اس نے مطب بند کر دیا، کتابیں باندھیں، اور ایسے سفر پر روانہ ہو گیا جس کا کوئی نقشہ نہ تھا، کوئی رفیق نہ تھا۔

وہ ہندوستان کے جنوبی جنگلات سے ہوتا ہوا نیپال کی پہاڑیوں، تبت کے برف زاروں، اور فارس کے ریگستانوں تک پہنچا۔ ہر مقام سے اس نے ایک نایاب جڑی بوٹی، ایک خاص مادہ، ایک عجیب و غریب جزو حاصل کیا۔ وہ کبھی خچر پر سوار تھا، کبھی پیدل، کبھی بیمار اور کبھی نڈھال، مگر اس کی آنکھوں میں ایک ہی تصویر تھی — فاطمہ کی مسکراہٹ، والد کی دعائیں، بہنوں کی ہنسی۔

کئی بار وہ موت کے قریب پہنچا، ایک بار برفانی تودے میں دبا، دوسری بار سانپ کے زہر سے قریب المرگ ہوا۔ ایک ہسپانوی کیمیا دان نے اسے دھوکہ دے کر مہینوں کی محنت چھین لی۔ مگر وہ کہتا، "میں وقت کو شکست دوں گا، چاہے وقت مجھے روند کر گزر جائے۔"

اس کی یادیں فقط ایک خالی خطوط کا ڈبہ رہ گئیں۔ شہر کے لوگ اسے بھول چکے تھے۔ عزیزوں نے سوگ منایا اور پھر خاموش ہو گئے۔ مگر وہ، اپنے علم کے جنون میں، ایک ایسے عہد کی تلاش میں تھا جو شاید وجود ہی نہ رکھتا ہو۔

یہ ایک ٹھنڈی، دھند آلود صبح تھی جب ڈاکٹر نے اپنی لیبارٹری کے آخری کمرے میں تجربے کی میز پر رکھے شیشے کو اٹھایا۔ اس شیشے میں ایک نیم شفاف مائع تھا، جس کی رنگت کبھی نیلاہٹ کی طرف مائل ہوتی، کبھی زردی میں تحلیل ہو جاتی۔ یہ وہ مرکب تھا جس کے لیے اس نے اپنی عمر، اپنا سکون، اپنی نیند، اپنی جوانی اور بالآخر اپنے پیاروں کی قربانی دی تھی۔ یہ وہی دوا تھی جو زندگی کو، وقت کو، فنا کو چیلنج کرنے کا دعویٰ رکھتی تھی۔

اس نے مرکب کی شیشی ہاتھ میں لی، لبوں تک لے آیا، لیکن ایک لمحے کو رُک گیا۔ ایک طویل وقفہ... جیسے وقت تھم گیا ہو۔ اُس نے شیشی کو واپس رکھا۔ "زندگی کا اصل حسن فانی ہونے میں ہے،" اُس نے کہا، جیسے کائنات کے کسی راز پر سے پردہ اٹھا رہا ہو۔

اس نے دراز میں رکھا ہوا ایک پُرانا تصویری البم نکالا۔ اس میں ماں کی مسکراہٹ تھی، باپ کے ماتھے پر پڑی فکرمندی

کی لکیریں تھیں، چھوٹے بھائی کے ہاتھ میں کتاب تھی، اور بیوی کی آنکھوں میں ایک انجانی تشویش۔ وہ سب جا چکے تھے۔ قبریں ویران ہو چکی تھیں، نام مٹنے لگے تھے۔ وہ خود اب بڑھاپے کی سرحد سے بھی آگے جا چکا تھا۔ جسم لرزتا تھا، آواز کانپتی تھی، آنکھیں دھندلا چکی تھیں۔

اس نے دوا والی شیشی اٹھائی، کھولی اور البم پر انڈیل دی، تھوڑی دیر بیٹھا تصویروں کو دیکھتا رہا چکرا کر گرا اور دم دے دیا۔

اس کا البم اس کے مرنے کے بیسیوں سال بعد تک بھی زندہ رہا۔